ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

مئی ۲۰۲۴ء

۱۵/روپئے

محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اترپردیش

وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ ’مینگو نمائش گاہ‘‘ میں۔

جناب وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ یوم ماحولیات کے موقع پر شجرکاری کرتے ہوئے۔

ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

اس شمارے میں...

اداریہ
اپنی بات ۲

مضامین

بانگ درا اور ادب اطفال	ڈاکٹر محبوب حسن	۳
رامائن کے اردو تراجم: تہذیبی اشتراک اور تخلیقی ہم آہنگی	ڈاکٹر ظفر النقی	۶
میرا بائی اور ان کی شاعری	زین اللہ صدیقی جلالپوری	۱۰
قصیدہ نگاری کی زرخیز زمین: دبستانِ لکھنؤ	ڈاکٹر نثار احمد	۱۲
کاظم علی خان کی ادبی شخصیت	حیدر رضا	۱۵
اردو میں نظریاتی تنقید: شارب ردولوی کے حوالے سے	محمد وسیم حسین بٹ	۱۷
زمیندارانہ نظام میں خانگی عورتوں کا مربوط بیانیہ 'ناگہانی'	زبیدہ نسیم	۲۰

منظومات

غزل	ساجد خیرآبادی	۲۲
غزلیں	کوثر صدیقی/ جنید اکرم فاروقی	۲۳
غزل	جاوید اکرم	۲۵
غزل	نفیس وارثی	۲۷

افسانے

پُراسرار کائنات	شمس الہدیٰ علیگ	۲۴
غریب کی عید	ڈاکٹر تمنا نسیم	۲۶
اُدھار	ندا احمد	۲۸
عہد	شاذیہ خان	۳۰

ترقیات

بہتر تعلیم سے یوپی کی بدلتی تصویر	شاہد عباس	۳۲

ماہنامہ نیا دور، information.up.nic.in ویب سائٹ پر دستیاب ہے۔
قیمت فی شمارہ: پندرہ روپے سالانہ رکنیت فیس: ایک سو اسّی روپے
دو سال کی رکنیت فیس: تین سو ساٹھ روپے
تین سال کی رکنیت فیس: پانچ سو چالیس روپے
نوٹ: اپنی کمپوز شدہ تخلیقات، مندرج ای: میل آئی ڈی پر ہی ارسال کریں۔
E:mail:nayadaurmonthly@gmail.com

جلد:79 شمارہ:01
ماہنامہ نیا دور لکھنؤ
مئی ۲۰۲۴ء
سرپرست
جناب سنجے پرساد
پرنسپل سکریٹری، محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اترپردیش
پبلشر: وشال سنگھ (ڈائرکٹر، انفارمیشن)
جناب انشمان ترپاٹھی (ایڈیشنل ڈائرکٹر، انفارمیشن)
ایڈیٹر
ریحان عباس
رابطہ: 9838931772
Email:nayadaurmonthly@gmail.com
معاون
شاہد کمال
نظارت: آسیہ خاتون، 9721856191
رابطہ برائے سرکولیشن و زرِ سالانہ:
صبا عرفی: 7705800953
تزئین کار: ایم. اے. ندوی
مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج لکھنؤ
شائع کردہ: محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اترپردیش
زرِ سالانہ: ۱۸۰ روپے
ترسیل زر کا پتہ
ڈائرکٹر انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
پنڈت دین دیال اُپادھیائے سوچنا پریسر، پارک روڈ،
اترپردیش، لکھنؤ 226001
Pleas send Cheque/Bank Draft in favour of Director,Information & Public Relation Department,Pandit Deendayal Upadhyay Soochna Parisar,UP,Lucknow
خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱
بذریعہ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ
ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
پارک روڈ، سوچنا بھون، اترپردیش لکھنؤ 226001

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اترپردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

اپنی بات

مئی ۲۰۲۴ء کا شمارہ قارئین کرام کی خدمت میں حاضر ہے۔
ماہنامہ نیا دور برصغیر میں شائع ہونے والے دیگر رسائل و جرائد میں اپنی مثالی انفرادیت کی وجہ سے اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ یہ اپنے ہم عمر رسائل میں اپنی اشاعت کے(78)اٹھہتر سال پورا کر چکا ہے۔غالباً اس عرصہ دراز میں بہت سے ایسے رسائل و جرائد بڑی شان وشوکت کے ساتھ شائع ہوئے اور ایک عرصہ دراز تک انھوں نے اپنے قارئین کے ذہن و دل دماغ پر حکمرانی کی اور اپنے زمانے کے ادیبوں،افسانہ نویسوں،محققین دانشوروں،مفکروں،قلمکاروں کی تخلیقات ونگارشات کو بڑے اہتمام سے شائع کیا،اور اردو دنیا میں لوگوں کی گفتگو کا مرکز کا توجہ رہا،اور اپنے قارئین کی ذہنی تربیت اور علمی استفادے کا ذریعہ بنا رہا لیکن بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ خود کو ہم آہنگ نہ کر سکے جس کی وجہ سے وقت کی رفتار کے آگے ان کی رفتار مند ہوگئی اور رسائل و جرائد اب ہمارے ادبی باقیات کا ایک حصہ بن گئے ہیں ۔اس کا مطلب یہ قطعی نہیں کی ان کی افادیت یا اس کا علمی معیار کم ہوگیا ہے۔
ایسا قطعی ممکن نہیں چونکہ علم ایک ایسی چیز ہے جس پر سنین ہو شہور گردش ماہ سال کا اثر نہیں ہوتا،لہٰذا وہ رسائل جو کنہیں وجوہات کی وجہ سے اپنی اشاعت سے محروم ہو چکے ہیں لیکن ان کے باقیات لائبریریوں ، یونیورسٹیوں ، کالجوں مدارس مکاتب میں موجود ہیں ،تو علم کے متلاشیان،اسکالرس وغیرہ آج بھی ان کے فیوضات سے فیضیاب ہو رہے ہیں ۔
ماہنامہ نیا دور کی یہی سب سے بڑی افادیت ہے کہ وہ وقت کے بدلتے ہوئے تقاضے زمانے کی رفتار کے ساتھ آج بھی قدم سے قدم ملا کر بغیر کسی توقف کے ساتھ چل رہا ہے ۔ایسے پُر آشوب وقت میں بھی شائع ہو رہا ہے جب کہ لوگوں کو اردو زبان بولنے سے زیادہ سننے میں بھی دقت لاحق ہو رہی ہے ۔اس کے باوجود بھی ُماہنامہ نیا دورُ اپنی آب وتاب کے ساتھ شائع ہو رہا ہے ۔
اتر پردیش کی موجودہ حکومت کی خصوصی توجہ کی وجہ سے یہ ممکن ہوا ورنہ یہ رسالہ بھی اپنی باقیات کا ایک حصہ بن چکا ہوتا۔واقعی یہ قابل تعریف بات ہے کہ نیا دور صرف شائع ہی نہیں ہو رہا ہے بلکہ اس میں شایع ہونے والے تمام تخلیق کاروں کو ان کے نگارشات کا ایک معین معاوضہ بھی دیتی ہے ۔خاص کر نئے لکھنے والے تخلیق کاروں کی کم سے کم حوصلہ افزائی ہوتی ہے،جس کی وجہ سے انھیں مزید لکھنے اور پڑھنے کی تحریک ملتی ہے ۔مجھے امید ہے ماہنامہ نیا دور کے قارئین کو گزشتہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی پسند آئے گا۔اگر آپ کو شمارہ پسند آئے تو اپنی آرا تحریری طور پر نیا دور کی آئی ڈی پر میل کر سکتے ہیں،بذریعہ ڈاک بھی بھیج سکتے ہیں ۔شکریہ

ریحان عباس

یہ شمارہ مئی ۲۰۲۴ء کا ہے۔جس کو جولائی ۲۰۲۵ء میں شائع کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر محبوب حسن

اسسٹنٹ پروفیسر،شعبۂ اردو،ڈی ڈی یو،گورکھپور یونیورسٹی،گورکھپور

8527818385

بانگ دراا ور ادب اطفال

اردو میں شعروادب کی ایک قابل فخر روایت موجود ہے۔اردو میں ادب عالیہ کے دوش بہ دوش ادب اطفال کی روایت بھی پرورش پاتی رہی۔اردو کے مایہ ناز ادیبوں اور شاعروں نے سنجیدہ ادبیات کے ساتھ نسل نو کی تربیت کو بھی اپنی ترجیحات میں شامل کیا۔ اس سلسلے میں علامہ اقبالؒ کا نام نہایت احترام سے لیا جاتا ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں فلسفۂ خودی کا نظریہ پیش کیا۔علامہ اقبالؒ کے فلسفۂ خودی کے سبب اردو کی شعری روایت فکروفن کی نئی نئی جہتوں سے آشنا ہوئی۔ ان کے چار شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔''بانگ درا''''بال جبرئیل''''ضرب کلیم''اور''ارمغان حجاز''۔ان چاروں شعری مجموعوں میں اقبالؒ کی تخلیقی بصیرت کا ارتقائی سفر نظر آتا ہے۔ان کا پہلا مجموعۂ کلام''بانگ درا''1924میں اشاعت پذیر ہوا۔''بانگ درا''کی ایک صدی مکمل ہونے پر مختلف قسم کی تقریبات منعقد ہو رہی ہیں۔''بانگ درا''میں غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ناقدین ادب نے اس مجموعۂ کلام کو فکروفن کا خوبصورت تحفہ قرار دیا۔''شکوہ''''جواب شکوہ''اور''خضر راہ''جیسی فلسفیانہ اور فکر انگیز نظمیں اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ادب اطفال کے حوالے سے بھی اقبالؒ کے مجموعۂ کلام کی ادبی معنویت سے انکار ممکن نہیں۔''پرندہ کی فریاد''''ترانہ ہندی''''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت''''پرندہ اور جگنو''''ایک مکڑا اور مکھی''''ایک پہاڑ اور گلہری''''ایک گائے اور بکری''''بچے کی دعا''''ہمدردی اور ماں کا خواب''جیسی خوبصورت نظمیں بانگ درا میں شامل ہیں۔علامہ اقبالؒ کی تخلیقی عظمت کی بہتر تفہیم کے لیے''بانگ درا''کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

اردو زبان میں ادب اطفال کی ایک قابل قدر روایت موجود ہے۔ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے ابتداء سے ہی بچوں کے لیے نظمیں اور کہانیاں تخلیق کیں۔ادب اطفال کی آبیاری کرنے والے ادیبوں میں خواجہ الطاف حسین حالیؔ محمد حسین آزاد،اسمٰعیل میرٹھی،عصمت چغتائی،قرۃ العین حیدر،تلوک چند محروم،جگن ناتھ آزاد اور شوکت پردیسی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔علامہ اقبالؒ کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعہ ادب اطفال کو فکروفن کی نئی جہتوں سے آشنا کیا۔انہوں نے اپنی تخلیقات میں اخلاقی قدروں کے ساتھ ساتھ ماحولیاتی موضوعات ومسائل کو بھی خاطر خواہ توجہ دی۔اخلاقی قدروں سے مزین علامہ اقبالؒ کی نظمیں ہمیں انسان دوستی،ہمدردی،مروت،صبروقناعت اور خلوص ومحبت کا درس دیتی ہیں۔علامہ اقبالؒ کی نظموں میں ایک نوع کا موسیقی آہنگ موجود ہے۔ان کی نظمیں خوبصورتی سے گائی جاسکتی ہیں۔ایک مکڑا اور مکھی،ایک پہاڑ اور گلہری،ایک گائے اور بکری،بچے کی دعا،ہمدردی،ماں کا خواب،پرندے کی فریاد،ترانہ ہندی،ہندوستانی بچوں کا قومی گیت،پرندہ اور جگنو جیسی بیش بہا نظمیں اقبالؒ کی تخلیقی بصیرت کا عمدہ ثبوت ہیں۔مذکورہ نظموں میں سے سات نظمیں انگریزی زبان وادب سے ماخوذ ہیں۔علامہ اقبالؒ کی نظموں کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے جگن ناتھ آزاد نے لکھا ہے:

> اپنے ملک وقوم کے بچوں کے مستقبل سے اقبالؒ کو بڑی دلچسپی تھی۔انہوں نے نونہالوں کی فکری آبیاری اور پرورش کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔بچوں کی ذہنی تربیت کے لیے انہوں نے ایسی دلکش نظمیں لکھی ہیں،جنہیں بچے شوق سے پڑھ کر ان میں بیان کی ہوئی تعلیمات پر عمل کر کے اپنے ملک کے ہی نہیں بلکہ دنیا کے اچھے شہری بن سکتے ہیں۔
>
> (اقبال کی کہانی،جگن ناتھ آزاد،ترقی اردو بیورو،۱۹۷۶،ص:۱۲)

علامہ اقبالؒ کی شاعری میں حیات وکائنات کے گہرے رموز موجود ہیں۔انہوں نے اپنے شعری سفر کا آغاز روایتی انداز میں غزل گوئی سے کیا لیکن جلد ہی فلسفیانہ شاعری کی جانب متوجہ ہو گئے۔فکروفلسفہ کے ساتھ ساتھ انہوں نے نونہالوں کی ذہنی تربیت پر بھی خاص توجہ مرکوز کی۔اقبالؒ کو اپنے وطن اور اپنی سرزمین سے والہانہ محبت تھی۔وہ حب الوطنی کو ایمان کا اہم جز تصور کرتے تھے۔

> ''انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں میں اخلاقی قدروں کے شانہ بہ شانہ سائنسی اور ماحولیاتی موضوعات ومسائل پر خاص توجہ دی جارہی ہے۔اگر ہم اردو کے حوالے سے ادب اطفال کا جائزہ لیں تو ہمیں مایوسی ہاتھ آتی ہے۔قابل غور ہے کہ موجودہ دور میں ہمارے یہاں چلڈرین لٹریچر کو دوئم درجے کا ادب تصور کیا جاتا ہے۔ادب اطفال کے تئیں ادیبوں اور شاعروں کی یہ بیزاری ہمیں دعوت فکر دیتی ہے۔ہمیں سائنسی اور ماحولیاتی موضوعات ومسائل کی جانب متوجہ ہونے کی اشد ضرورت ہے تاکہ ہمارے بچے عصری زندگی کے نت نئے تقاضوں سے واقف ہوسکیں۔دراصل خدا کی عطا کردہ بیش بہا نعمتوں کا تحفظ ہماری بنیادی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ماہرین نے فضائی آلودگی کو دنیا کا سب سے سنجیدہ اور نازک مسئلہ قرار دیا ہے۔''

اقبالؔ نے اپنی نظموں کے توسط سے وطن پرستی اور حب الوطنی کا خوبصورت پیغام دیا ہے۔ ترانہ ہندی، ہمالہ، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، نیا شوالہ جیسی اہم نظمیں علامہ اقبالؔ کے جذبات و احساسات کو آشکار کرتی ہیں۔ حب الوطنی پر مشتمل اقبالؔ کی نظموں میں ہندوستان کے قدرتی مناظر اور یہاں کے حسن و دلکشی کا خوبصورت تخلیقی اظہار موجود ہے۔ ان کی نظموں میں ملک کے جغرافیائی حسن مثلاً پہاڑوں، جھرنوں، ندیوں، پھل پھول اور چرند پرند کی تصویر کشی موجود ہے۔ ایسی تخلیقات بچوں کو قدرتی حسن اور ماحولیاتی نظام کے تئیں بیدار کرتی ہیں۔ ''ترانہ ہندی'' علامہ اقبالؔ کی نہایت مشہور نظم ہے۔ حب الوطنی سے لبریز یہ نظم ہمارے اندر اپنے وطن عزیز کے تئیں محبت کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ نظم ''ترانہ ہندی'' کے اشعار ملاحظہ ہوں:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی، دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا، ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں، اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشک جناں ہمارا
یونان و مصر روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا

دراصل نظم ''ترانہ ہندی'' اقبالؔ کی وطن پرستانہ شاعری کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ اس نظم میں ملک ہندوستان کی عظمت آشکارا ہے۔ اہل وطن میں قوم پرستی کا جذبہ پیدا کرنے کی غرض سے یہ نظم ملک کی مختلف قومی تقریبات کے موقع پر گائی جاتی ہے۔ خاص طور پر جشن آزادی اور یوم جمہوریہ کے موقع پر ہندوستانی فوج اس نظم کی دھن پر پریڈ کرتی ہے۔ بابائے قوم مہاتما گاندھی نے اقبالؔ کی اس نظم کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ انہوں نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے ''جب اقبال کی مشہور نظم ہندوستان پڑھی تو میرا دل بھر آیا اور بڑودا جیل میں تو سینکڑوں بار اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت میٹھے لگے اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ کون ایسا ہندوستانی دل ہے، جو اقبالؔ کا ہندوستان ہمارا سن کر دھڑکنے نہیں لگتا اور اگر کوئی ایسا دل ہے تو میں اسے اس کی بدنصیبی سمجھوں گا۔'' گاندھی جی کی ان باتوں سے نظم ''ترانہ ہندی'' کی ادبی اور سیاسی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

علامہ اقبالؔ نے اپنی نظموں کے توسط سے ملک کی گنگا جمنی تہذیب اور مذہبی یگانت کا بھی درس دیا ہے۔ اقبالؔ کسی بھی ملک کی ترقی اور کامیابی کے لیے قومی یکجہتی کو لازمی سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ قومی اتحاد کے بغیر کوئی بھی ملک ترقی نہیں کرسکتا۔ ان کی مشہور ترین نظم ''نیا شوالہ'' قومی یکجہتی کے اعتبار سے نہایت عمدہ تخلیقی فن پارہ ہے۔ اقبالؔ کے اولین مجموعہ کلام ''بانگ درا'' میں شامل یہ نظم اپنے موضوع اور انداز پیش کش کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس نظم میں اقبالؔ مختلف مذہبی طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے مخاطب ہیں۔ انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو فرقہ وارانہ یگانت اور مذہبی رواداری کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا پیغام دیا ہے۔ اس نظم میں انہوں نے واعظ اور برہمن کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اقبالؔ کو اہل وطن کے درمیان پیدا شدہ نفرت کا ماحول پسند نہیں۔ انہوں نے فرقہ وارانہ تعصب و عداوت کے لیے مذہبی تنگ نظری کو قصوروار ٹھہرایا ہے۔ اقبالؔ کی وطن پرستی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انھیں خاک وطن کا ہر ذرہ دیوتا لگتا ہے۔ علامہ اقبالؔ مذہبی تعصب کی دیوار گرادینا چاہتے ہیں تاکہ اہل وطن کے درمیان خلوص و محبت کا ماحول پیدا ہوسکے۔ ملک کی موجودہ سماجی وسیاسی صورت حال کے پس منظر میں اس نظم کی معنویت مزید بڑھ جاتی ہے۔ نظم ''نیا شوالہ'' کا ایک بند ملاحظہ ہو:

سچ کہہ دوں اے برہمن ! اگر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہوگئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تونے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا
تنگ آکے میں نے آخر دیروحرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے تیرے فسانے
پتھر کے مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں میں اخلاقی قدروں کے شانہ بہ شانہ سائنسی اور ماحولیاتی موضوعات ومسائل پر خاص توجہ دی جارہی ہے۔ اگر ہم اردو کے حوالے سے ادب اطفال کا جائزہ لیں تو ہمیں مایوسی ہاتھ آتی ہے۔ قابل غور ہے کہ موجودہ دور میں ہمارے یہاں چلڈرین لٹریچر کو دوئم درجے کا ادب تصور کیا جاتا ہے۔ ادب اطفال کے تئیں ادیبوں اور شاعروں کی یہ بیزاری ہمیں دعوت فکر دیتی ہے۔ ہمیں سائنسی اور ماحولیاتی موضوعات ومسائل کی جانب متوجہ ہونے کی اشد ضرورت ہے تاکہ ہمارے بچے عصری زندگی کے نت نئے تقاضوں سے واقف ہوسکیں۔ دراصل خدا کی عطا کردہ بیش بہا نعمتوں کا تحفظ ہماری بنیادی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ ماہرین نے فضائی آلودگی کو دنیا کا سب سے سنجیدہ اور نازک مسئلہ قرار دیا ہے۔ یہ ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ آج پورا سنسار طرح طرح کی مہلک بیماریوں سے پریشان ہے۔ کرونا جیسی عالمی وبا کے خوفناک نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ خوش آئند بات ہے کہ گزشتہ چند برسوں سے اردو زبان وادب میں بھی ان اقدار وروایات کی جانب خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔ علامہ اقبالؔ کے پہلے شعری مجموعہ ''بانگ درا'' میں مکڑا اور مکھی، پہاڑ اور گلہری، گائے اور بکری، پرندے کی فریاد جیسی خوبصورت اور سبق آموز نظمیں موجود ہیں۔ زیب النساء بیگم نے اقبالؔ کی نظموں میں موجود اخلاقی نکات پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اقبال کے بچوں کے کلام میں جو چیز قابل ذکر ہے، وہ اقبال کا اخلاقی نقطۂ نظر ہے۔ اقبالؔ کی فکر ونظر بلند اخلاقی قدروں کی طرف مائل ہے۔ ماخوذ نظموں میں فطرت کے بے شمار مناظر ومظاہر کا تذکرہ کرکے ان سے اخلاقی حکایتیں سنائی جاتی ہیں۔ سماج میں بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے جس صالح ماحول کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے پیش نظر اقبالؔ نے اخلاقی نظموں کو پیش کرکے ذہن کی پختگی اور فکری بالیدگی کا ثبوت دیا ہے۔''

(اقبال اور بچوں کا ادب، زیب النساء بیگم، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۲۰۰۰ء ص: ۱۶۳)

انسانی شخصیت کی تشکیل وتعمیر میں اخلاقی اقدار اساسی کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ ادیبوں اور شاعروں نے بچوں کی ذہنی تربیت کی غرض سے اخلاقی قدروں کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، اسمٰعیل میرٹھی اور علامہ اقبالؔ وغیرہ نے اپنی سبق آموز نظموں کے توسط سے نونہالوں کے اندر اخلاقی اقدار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کی مختلف

نظموں میں وفاداری، خلوص، محبت، رواداری، قربانی، نیکی اور ہمدردی کے پیغامات موجود ہیں۔اقبالؔ کی متعدد نظموں میں اخلاقی پہلونمایاں طور پر ابھرتا ہے۔انہوں نے اپنی نظم ’’ایک مکڑا اور مکھی‘‘ کے ذریعہ بے جا خوشامد اور جھوٹ سے بچنے کی تلقین کی ہے۔نظم ’’ایک پہاڑ اور گلہری‘‘ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ خدا نے دنیا کی ہر چیز کسی خاص مصلحت کے تحت بنائی ہے۔خدا کی نظر میں کوئی چیز چھوٹی یا بڑی اور اچھی یا بری نہیں ہوتی۔اس لیے انسان کو اپنی طاقت یا کسی خوبی پر غرور نہیں کرنا چاہیے۔نظم ’’ہمدردی‘‘ کے پس پردہ اقبالؔ نے نیکی اور اچھائی کا درس دیا ہے۔اس فن پارہ میں اقبالؔ نے اس بات کی نصیحت کی ہے کہ دوسروں کے کام آنے والا انسان ہی خدا کی نظر میں نیک ہوتا ہے۔مذکورہ نظمیں نصیحت آمیز اور ڈرامائی انداز میں بچوں کو متاثر کرتی ہیں۔نظم ’’پرندے کی فریاد‘‘ آزادی کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہے۔اقبالؔ نے یہ پیغام دیا ہے کہ غلامی ایک قسم کی لعنت ہے۔پیش نظر نظم بچوں کے ساتھ ساتھ ہر عمر کے لوگوں کو متاثر کرتی ہے۔اس نظم میں سبھی کے لیے بیش بہا پیغام ہے۔نظم ’’پرندے کی فریاد‘‘ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا
لگتی ہے چوٹ دل پر، آتا ہے یاد جس دم
شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا
وہ پیاری پیاری صورت، وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانہ

اقبالؔ کی غزلوں بالخصوص نظموں میں اس فلسفے کے گہرے نقوش ثبت ہوئے۔علامہ اقبالؔ نے قدیم شعری روایت سے قطع نظر آفاقی افکار ونظریات کو تخلیقی بصیرت کے ساتھ موضوع بحث بنایا۔اقبالؔ کے آفاقی اور ہمہ گیر فکر وفلسفہ کا اعتراف عالمی سطح پر کیا گیا۔ان کی تخلیقی عظمت کے پیش نظر ان پر بے شمار کتابیں اور مضامین لکھے گئے۔قابل غور ہے کہ ادب اطفال کے حوالے سے بھی علامہ اقبالؔ کی تخلیقی شخصیت ہمارے لیے قابل قدر ہے۔انہوں نے فلسفیانہ اور سنجیدہ شاعری کے علاوہ نونہالوں کی ذہنی پرورش پر بھی خصوصی توجہ دی۔علامہ اقبالؔ ملک ومعاشرے کی تشکیل وتعمیر کے لیے نئی نسل کی ذہنی تربیت کو لازمی سمجھتے تھے۔انہوں نے اپنی تخلیقی زندگی کے ابتدائی دور میں بچوں کے لیے متعدد اہم نظمیں تخلیق کیں۔ان کی نظمیں بچوں کی ذہنی ونفسیاتی کیفیت کے پیش نظر لکھی گئی ہیں۔اقبالؔ کی نظموں میں جگہ جگہ غضب کا ڈرامائی حسن موجود ہے۔ان کی نظمیں فکری وفنی دونوں اعتبار سے اپنی تخلیقی انفرادیت کا احساس دلاتی ہیں۔علامہ اقبالؔ کی نظموں میں موجود مکالماتی انداز نھیں دوسرے شاعروں سے ممتاز بناتا ہے۔انہوں نے ڈرامائی عناصر کے توسط سے اپنی نظموں میں تجسس اور دلکشی پیدا کرنے کی تخلیقی سعی کی ہے۔نظم ’’ایک مکڑا اور مکھی‘‘ سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں
دیکھو جسے دنیا میں خوشامد کا ہے بندہ
مکھی نے سنی جب یہ خوشامد تو پسیجی
بولی کہ نہیں آپ سے مجھ کو کوئی کھٹکا
انکار کی عادت کو سمجھتی ہوں برا میں
سچ یہ ہے کہ دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا
یہ بات کہی اور اڑی اپنی جگہ سے
پاس آئی تو مکڑے نے اچھل کر اسے پکڑا
بھوکا تھا کئی روز سے، اب ہاتھ جو آئی
آرام سے گھر بیٹھ کے مکھی کو اڑایا

علامہ اقبالؔ کے مجموعہ کلام ’’بانگ درا‘‘ میں ایسی کئی نظمیں ہیں، جس میں فنی اور جمالیات قدریں آشکارا ہیں۔اقبالؔ نے اپنی شاعری کے ذریعہ تعمیری فکر کو بنیادی اہمیت دی ہے۔سنجیدہ شاعری کے ساتھ ساتھ ادب اطفال پر مشتمل ان کی نظموں میں بھی ایک نوع کی فکرمندی جھلکتی ہے۔ہمارے یہاں ابتداء سے ہی ادب اطفال کی ایک قابل فخر روایت موجود ہے۔علامہ اقبالؔ نے اپنے تخلیقی ادراک کی بنا پر اسے مزید استحکام عطا کیا۔علامہ اقبالؔ نے اپنی غزلوں اور نظموں میں فکروفن کے نئے نئے تجربات کیے۔ادب اطفال پر مشتمل ان کی نظموں میں بھی فکری وفنی جدت پسندی کی خوبصورت مثالیں نظر آتی ہیں۔ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی ان کی نظموں کی عصری معنویت برقرار ہے۔ان کی نظموں سے بصیرت کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔علامہ اقبالؔ کی نظموں کا مکالماتی نظام ہمیں ایک نئے تخلیقی طرز احساس سے روشناس کراتا ہے۔دراصل علامہ اقبالؔ اردو شعر وادب کی ایک ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے، جس نے اردو شعر وادب کو فکری وفنی دونوں اعتبار سے متاثر کیا۔روایت شکن تخلیق کار علامہ اقبالؔ نے اردو شاعری کو ایک نئے جہان معنی سے روشناس کرایا۔ان کا مجموعہ کلام ’’بانگ درا‘‘ اردو کی شعری روایت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

کتابیات:

کلیات اقبال، علامہ اقبال، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۶
اقبال اور بچوں کا ادب، زیب النساء بیگم، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۲۰۰۰
اقبال کی کہانی، جگن ناتھ آزاد، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۷۶
اقبال سب کے لیے، فرمان فتحپوری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۰
اقبال فن اور فلسفہ، نورالحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۹
فہم اقبال، شمیم طارق، شفاعت بک ڈپو، مولوی گنج لکھنؤ، ۱۹۷۶

□□□

گزارش

برائے کرم اشاعت کے لیے اپنی تخلیقات کے ساتھ اپنے بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات، بینک اکاؤنٹ نمبر، بینک کا نام و برانچ کا نام، آئی ایف ایس سی کوڈ نمبر ضرور تحریر کریں۔

اس کے بغیر کسی بھی تخلیق کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا۔

Name:-
Account No:-
Bank and Branch Name:-
IFSC No:-

ایڈیٹر نیا دور

ڈاکٹر ظفر النقی

خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی لکھنؤ

9639205647

رامائن کے اردو تراجم: تہذیبی اشتراک اور تخلیقی ہم آہنگی

ہندوستان صدیوں سے مختلف علوم و فنون، فلسفہ و حکمت، اور مذہب و روحانیت کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں کی تہذیب، جسے ایک ”مشترکہ تہذیب“ (Composite Culture) کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، اپنے جوہری اسلوب میں ہمہ گیر، روادار اور فطری نمو کے امکانات سے لبریز رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس خطۂ زمین پر نہ صرف علمی سرگرمیاں پروان چڑھیں بلکہ روحانی افکار، اخلاقی نظام، جمالیاتی اظہار اور ادبی رجحانات نے بھی ایک منفرد طرزِ احساس کی تشکیل کی۔ بالخصوص وہ ادبی اصناف جو مذہبی یا روحانی اقدار سے ماخوذ تھیں، جنہوں نے نہ صرف اخلاقی اور عرفانی بصیرت فراہم کی بلکہ سماج کی تہذیبی روح کو بھی ایک مربوط شناخت عطا کی۔ دنیا کی ہر تہذیب میں کچھ نہ کچھ رزمیے (Epics) وقوع پذیر ہوئے ہیں، جو کسی قوم کے تاریخی شعور، روحانی ورثے، اور اجتماعی لاشعور کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر وقت کے سیلاب میں بہہ گئے یا اپنی اصل شناخت سے محروم ہو گئے۔ اس کے برعکس ہندوستانی تہذیب کی امتیازی شان یہ رہی ہے کہ اس کے دو عظیم رزمیے رامائن اور مہابھارت نہ صرف ہزاروں سال گزرنے کے باوجود زندہ و تابندہ ہیں بلکہ آج بھی اپنی فکری، مذہبی اور اخلاقی معنویت کے ساتھ زندہ روایت کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔ اس بقا کی اہم وجہ سناتن دھرم کے اندر ان رزمیاتی متون کا تقدس ہے۔ رام اور کرشن جیسے کردار محض ادبی تخلیقات یا رزمیاتی ہیرو نہیں بلکہ روحانیت، بھگتی، اور الہامی بصیرت کے نمائندہ کردار ہیں جنہیں سناتن دھرم کے پیروکار الوہی صفات کا حامل مانتے ہیں۔ اس طرح رامائن اور مہابھارت صرف عظیم بیانیہ متون نہیں بلکہ یہ ایک مکمل علمیات (Epistemology) وجودیات (Ontology) اور قدسیاتی جہت (Sacred Cosmology) رکھتے ہیں۔ ان متون میں جہاں خیر و شر کی کشمکش ملتی ہے وہیں انسانی اختیار، کرم و دھرم کا فلسفہ، اور وقت و تقدیر کی تعبیر بھی موجود ہے۔ رامائن کو بجا طور پر ہندوستان کا ’مہا بیانیہ‘ (Grand Narrative) کہا جا سکتا ہے کیونکہ یہ نہ صرف ایک مذہبی یا رزمیاتی قصہ ہے بلکہ ہندوستان کی اجتماعی نفسیات، تہذیبی شعور، اور اخلاقی نظام کا آئینہ دار بھی ہے۔

سنسکرت زبان جو سناتن دھرم کا مقدس لسانی وسیلہ رہی ہے اور اس بیانیے کی پہلی اور بنیادی زبان رہی ہے۔ اسی سنسکرت زبان میں وید، رامائن، اور مہابھارت جیسے صحائف لکھے گئے تاکہ ان کی روحانی تاثیر اور صوتی تقدس برقرار رہے۔ لیکن جیسے جیسے یہ متون اپنے تہذیبی سیاق سے آگے بڑھے، یہ عظیم متون مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر اپنی عصری معنویت کو برقرار رکھتے ہوئے ایک کثیر لسانی (Multilingual) اور کثیر ثقافتی (Multicultural) اظہار بھی اختیار کر گئے۔ یوں یہ تراجم محض لسانی تبدیلی نہیں تھے بلکہ ہر زبان میں نئے سیاق و سباق، نئی تعبیرات اور نئے جمالیاتی نظریات کے ساتھ ان متون نے ایک نئی زندگی پائی۔ اس طرح رامائن اور مہابھارت کو نہ صرف ہندوستان کے عظیم متون کے طور پر پڑھا گیا بلکہ ان کی آفاقی اخلاقیات، وجودی سوالات اور روحانی تعلیمات کو دنیا کے دیگر فکری نظاموں کے ساتھ بھی جوڑ کر دیکھا گیا۔ نتیجتاً، ہندوستانی ادب میں ان رزمیوں کی ادبی، جمالیاتی، الٰہیاتی، علمیاتی اور روحانی معنویت ایک مستقل حوالہ بن چکی ہے۔ یہ متون نہ صرف ماضی کی میراث ہیں بلکہ عصر حاضر میں بھی انسانیت کے فکری بحران کا حل پیش کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ رامائن نہ صرف ہندوستانی تہذیب کا ایک عظیم ادبی سرمایہ ہے بلکہ یہ برصغیر کی روحانی، اخلاقی اور معاشرتی زندگی کو سمجھنے کے لیے ایک نہایت اہم کلید بھی فراہم کرتا ہے۔ ہندوستان کی گہری تہذیبی روایت میں رامائن کو صرف ایک مذہبی یا رزمیاتی بیانیہ نہیں بلکہ ایک اخلاقی منشور اور روحانی دستور کے طور پر دیکھا جاتا ہے جو زندگی کے ہر پہلو کو ایک ہمہ گیر اور جاوداں تناظر میں پیش کرتا ہے۔ رامائن کی ہمہ زمانی معنویت اور جاوداں روحانیت نے نہ صرف ہندوستان کے دانشوروں، صوفیوں، اور مذہبی

”رامائن کا ترجمہ دنیا کی بہت سی زبانوں میں کیا جا چکا ہے فارسی زبان میں پہلا ترجمہ مغل شہنشاہ اکبر اعظم کے حکم سے ایک مسلم مولوی عبد القادر بدایونی نے 1889 میں نثر میں کیا تھا۔ اس کے بعد شہنشاہ جہانگیر کے عہد حکومت میں رامائن کے دو اہم تراجم فارسی زبان میں منظوم ہوئے، ایک ملا سعد اللہ مسیح کیرانوی نے کیا تھا، جس میں اشلوک کی تعداد 5407 ہے اور دوسرا ترجمہ گردھرداس نے کیا تھا، جس میں اشلوک کی تعداد 5900 ہے۔ اس کے علاوہ فارسی زبان میں گوپال نے 1645 عیسوی میں، چندر اسن بیدل نے ایک رام کتھا 1685 میں اور دوسری رام کتھا ”نگارستان رام“ کے نام سے 1693 میں شائع کی تھی۔ جس میں اشلوک کی تعداد 4906 ہے۔ امر سنگھ نے 1705 میں ’امر پرکاش‘ کے نام سے رام کتھا شائع کی تھی۔ امانت رائے لال پوری نے فارسی زبان میں عظیم رام کتھا کی تخلیق کی تھی۔“

مفکرین کو متاثر کیا بلکہ اس نے عالمی ادبیات اور مذہبی متون میں بھی ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔ رامائن صرف ایک ہندو مذہبی متن نہیں، بلکہ ایک ایسا بین المذاہب مکالمہ بن گیا تھا جو ہندوستانی وحدت کی بنیاد کو مستحکم کرتا تھا۔ والمیکی کی رامائن سنسکرت میں لکھی گئی تھی جو اس عہد کی اشرافیائی اور مذہبی زبان تھی، مگر وہ عوامی سطح پر مروج نہیں تھی۔ اس لسانی فاصلہ نے عوام کو رامائن کی روح تک براہ راست رسائی سے محروم رکھا۔ اسی خلا کو پُر کرنے کے لیے تلسی داس نے رامائن کو اودھی زبان میں 'رام چرت مانس' کی صورت میں پیش کیا۔ یہ ایک ایسا اقدام تھا جو نہ صرف لسانی جمہوریت کی علامت بن گیا بلکہ روحانی بصیرت کی عوامی ترسیل کا ایک غیر معمولی نمونہ بھی ثابت ہوا۔ تلسی داس کی رام چرت مانس محض ترجمہ نہیں، بلکہ ایک تخلیقی باز آفرینی (creative reinterpretation) ہے، جس میں رام کی شخصیت صرف ایک راجا یا ہیرو کے طور پر نہیں، بلکہ ایک مثالی مردِ خدا کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ اس تخلیق نے جہاں ایک طرف عوام کو رامائن سے جوڑا، وہیں دوسری طرف ایک نئی لسانی اور ادبی روایت کی بنیاد بھی رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ تلسی داس کی شہرت ایک عوامی سنت اور مصلح کی حیثیت سے چاروں طرف پھیل گئی۔ سنت کوی نابھا داس نے بھی اپنی کتاب 'بھگت مالا' میں تلسی داس کی روحانی عظمت اور ادبی قد و قامت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> " کل یگ میں عوام کو نجات دلانے کے لئے والمیکی نے تلسی کی شکل میں جنم لیا۔ تریتا یگ میں والمیکی نے 'رامائن' لکھی۔ اس مقدس گرنتھ کا ایک حرف بھی برہمن تیا کے دوش تک سے نجات دلا سکتا ہے۔ اب بھکتوں کی منگل کامنا کے لئے تلسی داس نے پربھو کے پرتاپ کو از سر نو پیش کیا ہے۔ اپنے برت کے مطابق وہ شری رام بھکتی میں دن رات انھی کا نام جپتے رہتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے زندگی اور موت کے سمندر کو پار کرنے کے لئے یہ کشتی بنائی ہے جس سے اس کل یگ کے تمام مصائب زدہ ذی روحوں کی مکتی ممکن ہے۔"

رامائن کا ترجمہ نہ صرف مختلف ہندوستانی زبانوں میں ہوا بلکہ اسے عالمی سطح پر بھی مختلف زبانوں میں منتقل کیا گیا تاکہ اس کے اندر چھپی آفاقی انسانی قدریں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکیں جن زبانوں میں رامائن کا ترجمہ کیا گیا ہے، ان میں فارسی زبان کو خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ فارسی مغلیہ عہد میں ہندوستان کی سرکاری اور علمی زبان تھی۔ اکبر کا عہد ہندوستان کی بین الادیان ہم آہنگی، فکری رواداری اور علمی مکالمے کا ایک روشن باب ہے۔ اکبر نے ایک جامع تہذیبی تصور کے تحت دارالترجمہ قائم کیا جس کا مقصد مختلف مذہبی اور تہذیبی متون کو ترجمہ کے ذریعے دوسروں تک پہنچانا تھا تاکہ مختلف مذاہب اور ثقافتوں میں ہم آہنگی اور تفہیم پیدا کی جاسکے۔ اور اس علمی اقدام کے پیچھے اکبر کا وہ وژن کارفرما تھا جس کے تحت اس نے دارالترجمہ قائم کیا تھا تاکہ ہندوستان کی مختلف تہذیبی روایتوں میں تفہیم اور مکالمہ پیدا کیا جاسکے۔ اسی دارالترجمہ کے زیر نگرانی کئی اہم مذہبی و ادبی متون کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا گیا جن میں اتھروید، مہابھارت، گیتا، پران، راج ترنگنی اور بالخصوص رامائن شامل ہیں۔ فارسی میں رامائن کا پہلا ترجمہ ابوالفضل نے کیا جب کہ مغل شہنشاہ اکبر اعظم کے حکم پر مولوی عبدالقادر بدایونی نے چار سال کی سخت محنت کے بعد 1589ء میں فارسی نثر کے قالب میں ڈھالا۔ اس علمی خدمت پر انھیں انعامات واعزازات سے نوازا۔ اکبر کے بعد شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں رامائن کے فارسی منظوم تراجم کا آغاز ہوا۔ اس دور میں دو بڑے تراجم سامنے آئے۔ ملا سعد اللہ مسیح کیرانوی نے ایک منظوم ترجمہ پیش کیا جس میں اشلوکوں کی تعداد 5407 ہے۔ گردھر داس نے دوسرا منظوم ترجمہ کیا جو 5900 اشلوک پر مشتمل تھا۔ یہ تراجم صرف ادبی مشق نہیں تھے بلکہ ایک تہذیبی ربط کی علامت تھے جس کے تحت ہندو مذہبی متون کو فارسی کے کلاسیکی اسلوب میں ڈھالا گیا تاکہ یہ فارسی داں طبقے تک بآسانی پہنچ سکیں۔ جہانگیری دور کے بعد بھی رامائن اور رام کتھا پر فارسی زبان میں کام جاری رہا اور کئی مسلم و ہندو علما و ادبا نے اسے اپنی علمی کاوشوں کا موضوع بنایا۔ گوپال نے 1645 میں فارسی میں رام کتھا لکھی۔ چندراسن بیدل نے دو اہم تخلیقات پیش کیں۔ ان میں ایک رام کتھا 1685 میں اور دوسری " نگارستانِ رام " کے نام سے 1693 میں شائع کی جس میں 4906 اشلوک شامل ہیں۔ امر سنگھ نے 1705 میں "امر پرکاش" کے نام سے رام کتھا تحریر کی جو فارسی میں اس روایت کا ایک اور نادر نمونہ ہے۔ امانت رائے لاپوری کی تخلیق اپنی مثال آپ ہے۔ انہوں نے رام کتھا کو پچیس برس میں مکمل کیا جس میں چالیس ہزار اشلوک شامل ہیں۔ یہ نہ صرف مقدار کے لحاظ سے بلکہ علمی محنت اور تہذیبی عزم کے لحاظ سے بھی ایک یادگار کارنامہ ہے۔ پنڈت سمیر چند نے محمد شاہ رنگیلا کے عہد (1735) میں ایک جامع رام کتھا لکھی جسے بعد میں رضا لائبریری رامپور نے تین جلدوں میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ فارسی زبان میں رامائن لکھنے والوں میں رام داس مصر، جگن کشور فیروز آبادی، منشی بانکے لال راز، مکھن لال ظفر، دیوی داس، ہری ولبھ سیٹھ، رام مہادیو ولی، منشی پرمیشوری پائے، منشی ہری لال رسوا، موہن سنگھ، آنند وھن خود اور جے کشن عشرت وغیرہ خاص طور سے اہمیت کے حامل ہیں۔ رامائن کے فارسی تراجم نہ صرف ہندوستانی تہذیب کی کثرت میں وحدت کے نظریے کو تقویت دیتے ہیں بلکہ یہ اس بات کا بھی ثبوت ہیں کہ علم، ادب اور روحانیت کی کوئی مذہبی یا لسانی سرحد نہیں ہوتی۔ یہ تراجم ایک ایسی دنیا کی تعمیر کرتے ہیں جہاں مختلف زبانوں، مذاہب، اور ثقافتوں کے درمیان احترام، تفہیم اور مکالمہ کی فضا قائم ہو۔

اردو ادب کی تاریخ کو اگر دیانت داری کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اردو زبان ہمیشہ سیکولر اقدار اور مشترکہ تہذیب کی نمائندہ رہی ہے اسی لئے اس زبان نے برصغیر کی ہندوستان کی قدیم روایت، ہندو مذہبی متون اور رزمیاتی اساطیر کو بھی اپنی گود میں جگہ دی ہے۔ اردو ادب کی یہ کثیر الثقافتی اور سیکولر فطرت اس کی سب سے بڑی طاقت اور امتیاز ہے۔ اسے کسی ایک مذہب یا قوم کے دائرے میں قید کرنا اس کی وسعتِ فکر اور تہذیبی رسائی کے ساتھ ناانصافی کے مترادف ہوگا۔ اردو زبان میں سناتنی ادب کو جس علمی، فکری اور جمالیاتی شعور کے ساتھ اپنایا گیا ہے، وہ اردو کی ادبی شمولیت (literary inclusiveness) اور بین المذاہب ہم آہنگی کا روشن ترین باب ہے۔ اگرچہ بعض ناقدین اردو ادب کو صرف اسلامی ادب کے دائرے میں محدود کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، لیکن اردو میں وید، رامائن، مہابھارت، بھگوت گیتا، منو سمرتی، پرانوں وغیرہ کے تراجم اور تشریحات نے اس محدود تصور کو سختی سے چیلنج کیا ہے۔ اردو زبان و ادب میں بھی رامائن کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ خواہ وہ منثور تراجم ہوں یا منظوم تفاسیر، اردو شعرا اور نثر نگاروں نے اس مقدس متن سے بھرپور استفادہ کیا۔ خاص طور پر تلسی داس کی رام چرت مانس کے اردو تراجم عوامی سطح پر زیادہ مقبول ہوئے کیونکہ یہ متن روحانیت، اخلاقیات، اور انسان دوستی کے ایسے درس دیتا ہے جو تمام مذاہب کے ماننے والوں کو یکساں متاثر کرتا ہے۔

اردو زبان میں ہندو مذہبی ادب کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے کیوں کہ اس کے تعلق سے ایک بڑا سرمایہ اردو ادب کے دامن میں بھی موجود ہے۔ اردو زبان میں اس طرح کا سرمایہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ نہیں ہے تو کسی صورت سے کم بھی نہیں ہے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ عوام کا ایک بڑا طبقہ اس عظیم سرمایہ سے متعلق معلومات نہیں رکھتا۔ اس سے تعلق

سے اردو میں جو ہندو دھرم سے متعلق ذخیرہ یکجا ہوا اس میں ہندو دھرم کے ماننے والوں کے پہلو بہ پہلو مسلمانوں نے بھی اپنی تحریروں سے اہم کردار ادا کیا ہے، اردو میں وید، رامائن، شری مد بھگوت گیتا، پران، منو اسمرتی، اور مہابھارت کے تراجم بڑی حد تک مسلم ادیبوں اسکالروں ،دانشوروں، شاعروں اور عالموں نے کئے ہیں۔ اردو کے اس سیکولر کردار کو کسی صورت فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اردو میں جن مذہبی شخصیات پر نظمیں تحریر کی گئی ہیں، ان میں شری رام چندر جی بھی ہیں جن کے واقعات رامائن میں بیان کئے گئے ہیں۔ رام جی کے کردار کو ہندوستانی تہذیب وثقافت کی علامت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اردو شاعری میں رام جی کے مثالی و آفاقی کردار اور ان کی عظیم شخصیت کے تذکرے موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رام جی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے علامہ اقبال نے ان کو 'امام ہند' کے لقب سے یاد کیا ہے۔

ہے رام کے وجود سے ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند

رامائن کے واقعات بہت طویل ہیں اور اس کی ایک داستان میں کئی کئی چھوٹی داستانیں موجود ہیں اس کتاب کے جہاں دوسری زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں، اردو زبان میں بھی کثرت کے ساتھ منظوم ومنثور تراجم کئے گئے۔ اور رامائن کے قصص اور واقعات پر اردو میں متعدد نظمیں بھی گئیں جن میں چکبست کی نظم "امائن کا ایک سین" بہ طور مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ یہ نظم اردو شاعری کی اس روایت کا حصہ ہے جو اساطیری واقعات کو نہ صرف ادبی سطح پر برتتی ہے بلکہ ان میں سے اخلاقی وفکری نکات اخذ کر کے عصری معنویت فراہم کرتی ہے۔ اردو میں رامائن، گیتا، اور دیگر سناتنی متون کے ترجموں میں مسلم اور غیر مسلم مترجمین، ادبا اور شعرا نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی علمی کوششوں نے یہ ثابت کیا کہ اردو زبان کا دامن کسی مخصوص عقیدے سے بندھا ہوا نہیں بلکہ یہ ایک بین المذاہب، تہذیبی اور فکری پل کا کام کرتی ہے۔ اردو کے مسلم اور غیر مسلم ادبا وشعرا نے جن ہندو مذہبی متون کا ترجمہ کیا ان میں رامائن، گیتا، مہابھارت اور پرانوں کے ساتھ ساتھ منوسمرتی جیسے قانونی و مذہبی متن بھی شامل ہیں۔ ان ترجموں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اردو ادبا و شعرا نے محض علمی مشق کے طور پر نہیں بلکہ ہندوستانی تہذیب کو سمجھنے کے لیے ان متون کو اپنایا۔

اردو زبان کی ادبی روایت ایک ہمہ گیر، روادار اور تہذیبی لحاظ سے جامع روایت رہی ہے۔ اس زبان کا بنیادی مزاج ہی مذہبی رواداری، ثقافتی ہم آہنگی اور آپسی میل جول پر مبنی ہے۔ اسی مزاج نے اردو کو نہ صرف مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان ایک ثقافتی پل کی حیثیت عطا کی بلکہ اسے وہ لسانی ظرف بھی عطا کیا جس میں ہندوستان کی تمام اقوام کی علمی و روحانی صدائیں سماتی گئیں۔ اسی تہذیبی ولسانی ہم آہنگی کے نتیجے میں اردو زبان میں بھی سنسکرت کے مقدس رزمیہ رامائن کے تراجم کی ایک توانا روایت قائم ہوئی اور وہ بھی صرف ہندو شعرا و ادبا کے ذریعے نہیں بلکہ مسلم اہلِ قلم نے بھی اس میں سرگرم اور خلوص آمیز حصہ لیا۔ یہ ایک ایسی بین المذاہب ادبی یکجہتی کی مثال ہے جس پر اردو فخر کرسکتی ہے۔ اردو کے مسلم شعرا اور ادبا نے رام چندر جی کو محض ایک مذہبی کردار کے طور پر نہیں بلکہ ایک مثالی، اخلاقی اور تہذیبی شخصیت کے روپ میں دیکھا۔ ان کی ذات کو سچائی، قربانی، اطاعت، عدل اور خدمت جیسے اوصاف کا مظہر قرار دیا گیا۔ چنانچہ رامائن کا اردو میں ترجمہ نہ صرف ایک لسانی عمل رہا بلکہ اس کے پیچھے ایک روحانی واخلاقی مکالمہ بھی کارفرما رہا ہے۔ نہ صرف اردو میں رامائن کے تراجم کی فہرست طویل اور قابل فخر ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو سے زائد منظوم ومنثور تراجم اردو زبان میں شائع ہوچکے ہیں، جن کا دائرہ صرف ترجمہ تک محدود نہیں بلکہ بعض صورتوں میں تخلیقی باز آفرینی (creative reimagining) کی صورت بھی اختیار کر چکا ہے۔ غیر مسلم شاعروں کے ساتھ جن مسلم شاعروں اور ادیبوں نے رامائن کا ترجمہ کیا ہے یا اپنی تخلیقات میں اس مذہبی متن سے استفادہ کیا ہے، ان میں ابراہیم عادل شاہ ،نظیر اکبر آبادی، حالی، اقبال، ظفر علی خاں، جوش، مجاز، احسان دانش جاں نثار اختر، تاباں، علی جواد زیدی، مظفر حنفی، شاد عارفی اور مہدی نظمی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ تاہم یہاں ان کا تفصیلی تذکرہ کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس بات کی نشاندہی کرنا تھی کہ اردو زبان میں رامائن کے ترجمے میں غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ مسلم شاعرون اا ور ادیبوں نے بھی اہم کردار ادا کیا اور جس کو کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ اردو زبان میں رامائن کے ترجمے کی روایت پر قدرے تفصیل سے گفتگو کرنا مقصود ہے تا کہ اردو زبان میں اس روایت کا ایک رخ روشن ہوسکے۔

اردو زبان میں رامائن کا اولین ترجمہ گنگا بشن نے 1766 میں کیا۔ اگر چہ اس کا ابتدائی دور میں اتنا ذکر نہیں ہوا لیکن یہ کام اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس نے اردو زبان میں رام کتھا کی بنیاد رکھی۔ یہ ترجمہ بعد میں راجہ بنارس کی سرپرستی میں 1852 میں شائع ہوا، جو اس کی تاریخی قدر و قیمت کو بڑھاتا ہے۔ رامائن کا دوسرا اہم ترجمہ لچھپت رائے مانک پوری نے 1863 میں پیش کیا جو 150 صفحات پر مشتمل رام کتھا ہے۔ یہ ترجمہ اختصار کے باوجود مواد، ترتیب اور اسلوب کی سادگی کی وجہ سے مقبول رہا اور ایک متوسط قاری کے لیے بھی قابل فہم رہا۔ اردو میں رامائن کا پہلا مقبول ترین منظوم ترجمہ منشی جگن ناتھ لال خوشتر نے 1850 میں نواب واجد علی شاہ کے عہد میں لکھا۔ یہ ایک اہم تاریخی واقعہ ہے کہ اس ترجمے کو پہلے پہل نواب کے دربار میں پیش کیا گیا اور بعد میں 1864 میں منشی نول کشور نے اسے شائع کیا جو اس دور کا ایک بڑا اشاعتی ادارہ تھا۔ اس ترجمے میں اٹھارہ ابواب پر مشتمل رامائن کے واقعات کو شعری پیرایہ میں نہایت لطافت اور تخلیقی مہارت کے ساتھ نظم کیا گیا ہے۔ یہ منظوم ترجمہ اپنی زبان کی لطافت، سادگی، برجستگی اور شاعرانہ ہنرمندی کی بنیاد پر بہت زیادہ مشہور ہوا۔ اس ترجمے میں لکھنوی مثنوی کی ہیئت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

جہاں آباد تھا عدل و کرم سے
کوئی واقف نہ تھا نام ستم سے
جہاں میں تھا یہ اس کے عدل کا زور
قوی تر پیل سے ہر ناتواں مور
درندے رعب سے تھے اس کی سب زیر
ہرن پھرتے تھے بن بن ہر طرف شیر

شنکر دیال فرحت لکھنوی نے تلسی داس کی رامائن 'رام چرت مانس' کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ 1885 میں شائع ہوا۔ فرحت لکھنوی نے تلسی داس کی بھکتی اور فکری گہرائی کو اردو مثنوی کے قالب میں اس انداز سے پیش کیا کہ سلاست، روانی اور شگفتگی ان کی زبان کی نمایاں خصوصیات بن گئیں۔ ان کی زبان اگر چہ سادہ ہے، مگر اس سادگی میں ایک روحانی چمک، ایک شاعرانہ لطافت ہے جو عام قاری کے ساتھ ساتھ شعری وادبی ذوق رکھنے والوں کو بھی اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ان کی شاعری میں عقیدت اور فن کا ایسا امتزاج ہے جسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ فرحت نے مثنوی کی شکل میں رام کتھا کو نہ صرف منظوم کیا بلکہ اس میں اپنی لسانی مہارت، مذہبی شعور اور تہذیبی آگہی بھی شامل کی جو اردو شاعری میں کم کم دکھائی دیتی ہے۔ فرحت کا ترجمہ محض ایک ادبی یا مذہبی عمل نہیں بلکہ ان کے روحانی میلان، عقیدت مندی اور اخلاقی وابستگی کا مظہر بھی ہے۔ وہ رام چندر جی کو صرف ایک دیوتا کے طور پر پیش نہیں کرتے بلکہ انہیں ایک "یگ پرش" یعنی عہد

کے عظیم انسان کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ یہ تعبیر صرف سناتن دھرم کے مابعد الطبیعیاتی تناظر کو نہیں بلکہ عصری انسانی اقدار جیسے انصاف، مساوات، رحم دلی اور اخلاقی عظمت کو بھی مخاطب کرتی ہے۔ فرحت کے نزدیک رام ایک ایسا الٰہی نمائندہ ہے جس کی آمد کا مقصد زمین پر عدل وانصاف کا قیام، انسانیت کی فلاح اور بدی کا خاتمہ ہے۔ ان کا کلام محض شعری بیانیہ نہیں بلکہ قلبی اور روحانی وابستگی کا آئینہ دار ہے۔ یہ پہلو اس ترجمے کو محض ترجمہ نہیں بلکہ ایک عبادت نما شعری عمل بنا دیتا ہے۔ فرحت نے اردو کو محض ایک ترجمے کا وسیلہ نہیں بنایا بلکہ اسے ایک ایسا تہذیبی اور اخلاقی پل بنایا ہے جس پر سناتنی اقدار اور اردو شعریات یکجا ہو کر قاری کو روحانی حظ بخشتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

رہے لب پر جناب رام کا ذکر
کہ ہے یہ دافع اندیشہ و فکر
اودھ سے جب جناب لچھمن و رام
ہوئے داماں صحرا سبک گام
ہم آغوش الم ترک وطن سے
کمال درد و غم سیتا ہرن سے

دوار یکا پرشاد افق کے بڑے بھائی منشی رام سہائے تمنا لکھنوی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ منشی تمنا کی علمی سرگرمیاں شاعری، ترجمہ نگاری، تاریخ نویسی اور صحافت جیسے وسیع میدانوں کو محیط تھیں۔ ان کی تاریخی تصانیف میں ملکِ اودھ کی تاریخ، احسن التواریخ، اشرف التواریخ اور افضل التواریخ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جو ان کے تاریخی شعور، تحقیقی مہارت اور نثر نویسی کی پختگی کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ تاریخی اسلوب میں ان کی تحریریں اس دور کے سیاسی و سماجی حالات کا آئینہ ہیں اور ان میں حقائق نگاری، متوازن بیانیہ اور زبان کی شائستگی نمایاں ہے۔ یہ کتب صرف تاریخی معلومات کا ذخیرہ نہیں بلکہ اودھ کی تہذیبی اور ادبی تاریخ کا اثاثہ بھی ہیں۔ منشی تمنا نے اودھ اخبار جیسے معتبر اخبار کے لیے طویل عرصے تک مضامین لکھے۔ ان کے مضامین میں زبان کی فصاحت و بلاغت، موضوع پر گہری گرفت، اور اصلاحی وتنقیدی شعور واضح طور پر نظر آتا ہے۔ 1911 میں انھوں نے اپنا ذاتی رسالہ "دربار" جاری کیا جو اس وقت کی ادبی صحافت کا ایک نمائندہ جریدہ ثابت ہوا۔ اس رسالے کے ذریعے وہ فکری مکالمہ، مذہبی ہم آہنگی اور تاریخی شعور کو عام کرنے کے علمبردار بنے۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری کا مجموعہ "چمنستانِ تمنا" کے عنوان سے منظر عام پر آیا جس میں ان کی لطیف طبع، زبان دانی، اور شعری ندرت کے آثار نمایاں ہیں۔ لیکن ان کی اہم ترین خدمات میں رام کتھا کا اردو میں منظوم ترجمہ شامل ہے۔ انھوں نے رامائن کے مختلف نسخوں پر مبنی کم وبیش دس منظوم رامائنیں تحریر کیں جن میں "نغمۂ رامائن" رامائن بھاکا اور شنکشا والی رامائن خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان منظوم تراجم میں تلسی داس کی روحانی گہرائی، اخلاقی پیغام اور رزمیہ شان کو اردو شاعری کے لسانی حسن کے ساتھ ہم آہنگ کیا گیا ہے۔ تمنا نے اپنی شاعری میں رام کو محض دیومالائی کردار کے طور پر نہیں بلکہ اخلاقی اقدار، عدل و رحم اور انسانی وقار کے علمبردار کے طور پر پیش کیا ہے، جو اردو کے بین المذاہب و بین الثقافتی مکالمے کی ایک روشن مثال ہے۔

رامائن کے مترجمین میں ایک اہم نام دوار یکا پرشاد افق لکھنوی کا ہے۔ علی جواد زیدی کی تحقیق کے مطابق والمیکی رامائن کے اردو تراجم ایک پرمیشر دیال کا اور دوسرا دوار یکا پرشاد افق کا ہے۔ دوار یکا پرشاد افق کا ترجمہ رواں اور با محاورہ ہے۔ انھوں نے والمیکی رامائن کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا اور یہ منظوم ترجمہ منشی نول کشور پریس نے 1804 میں شائع کیا تھا۔ افق کا یہ ترجمہ نہ صرف اردو ادب اور ہندوستانی ثقافتی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے بلکہ مذہبی، ثقافتی اور لسانی رواداری کا بھی ایک اہم نمونہ ہے۔ انھوں نے بالمیکی کے رامائن کی روح کو برقرار رکھتے ہوئے اسے اردو کے منظوم انداز میں ڈھالا۔ کہانی کی ترتیب، واقعات کی پیشکش اور کرداروں کی عکاسی اس طرح کی گئی ہے کہ قاری کی دلچسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ اس ترجمے میں رام جی کی شخصیت کو شعری پیکر میں اس طرح سے منور اور روشن کیا ہے کہ قاری اس منظوم ترجمے کو پڑھتے ہوئے اس کے جادو میں کھو جاتا ہے۔ افق لکھنوی نے اس ترجمے کے ذریعے غیر سنسکرت قارئین کو رام کی عظیم شخصیت کے متنوع پہلوؤں اور رامائن کی اخلاقی اور روحانی تعلیمات سے روشناس کرایا ہے۔ اس طرح سے ترجمہ انھوں نے ہندو اور مسلم برادریوں کو ایک مشترکہ ادبی اور ثقافتی ورثے سے جوڑنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اس منظوم ترجمے میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے سادگی سے پر تخلیقی زبان، ہندو پرانوں کی تلمیحات اور ہندوستانی استعارات وتشبیہات کا استعمال کیا ہے جس سے ان کی شاعرانہ ہنرمندی، تخلیقی بصیرت اور ہندوستانی تہذیب وثقافت اور اس کی تاریخ کے تعلق سے معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ترجمہ اردو کی سیکولر روح اور مذہبی رواداری کی ایک روشن مثال ہے۔ ایک بند ملاحظہ فرمائیں

رام کا چشمۂ قدرت تھا سفر میں جاری
راہ میں خاک کف پا سے اہلیا تاری
پہنچے متھلا تو سوئمبر کی ملی تیاری
آئی دیدار کو دوڑی ہوئی خلقت ساری
باغ میں الفت سیتا ہوئی چار آنکھوں سے
دونوں دیکھا کئے جلوؤں کو ہزار آنکھوں سے

اردو میں رامائن نظم کرنے والوں میں خاص طور پر بانکے لال بہاری، جوالا پرساد برق، سورج نرائن مہر، جگناتھ خوشتر، ہری نرائن شرما ساحر، پنڈت سدرشن، سورج پرساد تصوّر، بنواری لال شعلہ، بابو لال نبودی، شری سکھ دیو لال، پنڈت لچھمی دت، شیو پرساد راحل، منشی گھوبر دیال، بابو رام سہائی کپور، شیو برت لال ورمن، پنڈت رادھے شیام، نانک چند نانک، بیدی لال چند لال، ستیہ پال بھاردواج، ہیرالال موریا، شیو ناتھ رائے تسکین، پنڈت میلا رام وفا، منشی جگناتھ اطہر، رگھونندن سنگھ ساحر دھلوی اور منشی رام سہائے تمنا کے دوش بدوش مسلم ادبا و شعرا میں جناب مہدی نظمی، طالب الہ آبادی، نفیس خلیلی، رند رحمانی، محمد امتیاز الدین خاں اور صفدر آہ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اردو زبان رامائن کے تراجم انیسویں اور بیسویں صدی کی مختلف دہائیوں میں ایک رجحان کی صورت اختیار کر چکے تھے اور اس رجحان سازی میں ہندو شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ مسلمان شاعروں اور ادیبوں نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو میں رامائن کے ترجموں سے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستان کی ساجھی وراثت میں ہر مذہب وملت کے دانشوروں نے بڑی کشادہ قلبی کے ساتھ کام لیا ہے۔ اور یہی ثقافتی تخصص ہندوستان کی اصل شناخت ہے۔ اردو زبان میں رامائن کے تراجم نہ صرف لسانی ہم آہنگی کا مظہر ہیں بلکہ یہ اس امر کا زندہ ثبوت بھی ہیں کہ زبانیں مذہب کی پابند نہیں ہوتیں اور ایک زبان اپنے دامن میں مختلف تہذیبوں، عقائد اور اقدار کو عقیدت، تحقیق اور تخلیق کے ساتھ سمو سکتی ہے۔ اردو نے رامائن کو قبول کیا اسے گنگا جمنی تہذیب کا حصہ بنایا اور اس کی روشنی میں اپنی روحانی شناخت کو اور زیادہ تابناک کیا۔

□□□

زین اللہ صدیقی جلالپوری
اسٹیٹ بینک کے پیچھے گاندھی نگر، بستی
7355539026

میرا بائی اور ان کی شاعری

میرا بائی میڑتا کے راؤ رتن سنگھ کی لڑکی تھیں۔ ان کی ماں کا بچپن میں ہی انتقال ہوگیا۔ ان کے والد راؤ رتن سنگھ مہاراجہ چتّوڑ کے دربار سے وابستہ تھے۔ وہیں ان کی پرورش اور برداخت بھی ہوئی۔ وہ ہمیشہ جنگی امور میں منہمک رہے۔ میرا کا خاندان بے حد مذہبی تھا۔ بچپن ہی میں ماں کی موت اور باپ کی مصروفیت نے ان کو بھکتی اور خدا پرستی کی جانب مائل کر دیا اور ان کا زیادہ تر وقت سادھو، سنتوں کے ساتھ گذرنے لگا۔ کھیل ہی کھیل میں ''گردھر لال'' کو اپنا سوامی سمجھ بیٹھیں۔ میرا بائی کی شادی میواڑ کے راجکمار کنور بھوج راج سے ہوئی۔ قدرت کی یہ بھی عجیب مصلحت تھی کہ وہ اور ان کے شوہر دونوں کی طبیعتیں حقیقی شاعری کی سچی جلوہ گاہ تھیں۔ یہ دونوں اپنا زیادہ تر وقت اسی فن لطیف کی محویت کی نذر کر دینا اپنا حاصل زندگی سمجھتے تھے لیکن ان کی شادی شدہ زندگی بہت ہی مختصر رہی۔ وہ شادی کے صرف آٹھ سال بعد فقط بیس سال کی عمر میں بیوہ ہوگئیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد میرا محل کے آرام و آسائش چھوڑ کر کرشن بھکتی میں مصروف ہوگئیں اور میواڑ چھوڑ کر ''دواریکا'' چلی گئیں۔ میرا شروع ہی سے شری کرشن کی محبت میں سرشار تھیں۔ میرا کو کرشن جی سے ایک خاص عقیدت تھی۔ جیسا کہ ''کاظم علی خاں'' لکھتے ہیں:۔ ''کرشنائی مسلک کے گیت اور بھجنوں کو مقبول کرنے میں میرا بائی نامی شاعرہ کا اہم حصہ رہا ہے۔۔۔۔۔''
میرا کی نظمیں نغمہ کی سی کیفیت کی حامل ہیں یہ جذبات نگاری، عشق اور کرشن جی سے عقیدت سے بھری ہوئی ہیں۔''

میرا کا عقیدہ تھا کہ ایشور خود بندرا بن کے ایک خوبصورت گوالے کی ذات میں جلوہ گر ہے۔ کرشن کی محبت کا تیر کھا کر وہ خوش تھیں۔ کرشن کی بھکتی کی جانب ان کی محویت اس قدر بڑھ گئی کہ وہ اپنے آپ کو گوکل کی ایک ''گوپی'' سمجھنے لگیں اور فرطِ محبت میں ''ہری! ہری!!'' کا پیارا نام ان کی زبان پر ہمیشہ رہنے لگا۔ وہ کرشن کی بھکتی میں ڈوبی ہوئی ''پگ گھنگھرو باندھ'' کے ناچنے لگیں۔ انھوں نے اپنے تمام جذبات و خیالات صرف اس بانسری والے کے لئے وقف کر دئے۔ ان کی صرف ایک آرزو تھی اور یہ تھی:۔

بَسو مُورے نَینَن میں نَند لال
مُوہنی مُورتی سانوری صُورتی نینا بنے ویشال
اَدھر سُدھارَس مُرلی رَاجَت وُر بے جینتی مال

میرا اپنی زندگی کی ساری خوشیاں کرشن کے قدموں میں قربان کر کے انھیں اپنا سوامی مانتی تھیں۔ وہ شری کرشن کی بے مثال محبوبہ ہیں اور مُور مُکُٹ والے کے سوا کسی اور کو قبول نہیں کرتیں۔ وہ کہتی ہیں۔

میرے تو گِردَھر گُوپال دوسرا نہ کُوئی
جاکے سِر مُور مُکُٹ میرو پتی سوئی

کرشن کی سچی عبادت کی رسم ہندی ادب میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے لیکن میرا کی محبت کرشن بھکتی میں ڈوب کر ایک انوکھی چیز بن گئی ہے۔
ابھی تک میرا کی چار تصانیف کا ذکر ملتا ہے۔ جن کے نام یہ ہیں (۱) نَرسی جا کا مائرا، (۲) گیت گووند ٹیکا، (۳) راگ گووند، (۴) راگ سورٹھ۔ لیکن میرا کی ''پداولی'' ہی خاص طور پر قابل ذکر ہے جو ان کے گیتوں اور بھجنوں کا مجموعہ ہے۔ میرا بائی کے بھجن برج بھاشا میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں بے پناہ شرینی اور سادگی پائی جاتی ہے۔ میرا کی شاعری میں فراق، درد اور سوز وگداز بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے محبوب کو خطوط بھی لکھنا چاہتی ہیں اور اس کے لئے سنگار بھی کرتی رہتی ہیں۔ وہ اس کے انتظار میں بے چین بھی ہوتی ہیں اور اسے جنگل جنگل ڈھونڈتی بھی پھرتی ہیں۔
بے چینی کا عالم دیکھئے۔

''میرا کا بیشتر وقت قریب کے مندر میں جا کر کرشن کی پرستش میں گذرتا تھا۔ ان کا جنونِ محبت اس قدر بڑھ چکا تھا کہ انھیں دنیا والوں کی خبر یا پرواہ نہ تھی۔ وہ دیوانی ہوگئی تھیں۔ ان کے ہونٹوں سے جو نغمہ پھوٹتا تھا وہ عوام کے دلوں میں سرور و نشہ پیدا کر دیتا تھا۔ لوگ انھیں مندر میں جاتے ہوئے دیکھ کر ان کے صدا بند نغمہ کے لیے بیتاب ہو جاتے اور شوالے کے چاروں طرف ایک بھیڑ لگ جاتی۔ میرا کے بھجنوں میں سچّی محبت و عقیدت اور موسیقیت حد درجہ پائی جاتی ہے جو سننے والوں کے دل و دماغ میں کیف و سرور اور معرفتِ الٰہی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ میرا کی شاعری قلبی واردات کی سچّی تصویر ہے۔ انقلابِ زندگی، دنیا کی بے ثباتی اور سوز وگداز ان کی شاعری میں رچا بسا ہے۔ ان کے ہر ہر لفظ سے غم و الم کا اظہار ہوتا ہے۔''

جن کا پیا پَردیس بَست ہے
لِکھ لِکھ بھیجے پاتی
مُور پیا مُورے ہردے بَست ہے
نا کہوں آتی جاتی

انھیں اس کے دیدار کی بھی خواہش رہتی ہے۔

دَرَس بِنُوں دُوکھن لاگے نین

فرطِ محبت میں بے چینی کا عالم دیکھئے۔

اے ری ! میں تو پریم دیوانی
میرا درد نہ جانے کوئی
گھائل کی گتی گھائل جانے
اور نہ جانے کوئی
درد کے مارے بَن بَن ڈولُوں
بَید مِلا نہیں کوئی
میرؔا کی پرؔبھو پِیَر مٹے گی
جب بید سانوریا ہوئی

تصوف میں ڈوبے ہوئے میرؔا کی بھکتی آمیز نغمے ملاحظہ ہوں۔

پَا یُو جی میں تو رام رَتَن دَھن پایو
جنَم جنَم کی پونجی پائی جگ میں سبھی کُھو وایو
خرچ نہیں کوئی چور نہ لیوے دن دن بڑَ ھت سوایو
میرؔا کے پَربھو گردَھرنا گر ہَرَکھ ہَرَکھ جَس گایو

میرؔا کی آواز میں جادو تھا اور ان کے گانے میں سحر جو سننے والوں کے دلوں کو موہ لیتا تھا۔ ان کے شیریں ترنّم کی ہلکی سی جنبش بھی لوگوں کے دلوں کو مسحور کر دیتی تھی۔

میرؔا کا تصوف اور کرشن کے لیے محبت اور محویت حد سے بڑھی تو میرؔا نے جُوگن کا روپ دھار لیا اور گیروئے لباس پہن کر شری کرشن جی کی والہانہ محبت میں سرشار ہو کر کرشن نگر یعنی بندرا بن میں رقص و نغمہ میں مصروف ہو گئیں۔ میرؔا کا بیشتر وقت قریب کے مندر میں جا کر کرشن کی پرستش میں گذرتا تھا۔ ان کا جنونِ محبت اس قدر بڑھ چکا تھا کہ انھیں دنیا والوں کی خبر یا پروا نہ تھی۔ وہ دیوانی ہو گئی تھیں۔ ان کے ہونٹوں سے جو نغمہ پھوٹتا تھا وہ عوام کے دلوں میں سرور و نشہ پیدا کر دیتا تھا۔ لوگ انھیں مندر میں جاتے ہوئے دیکھ کر ان کے صدا بند نغمہ کے لیے بیتاب ہو جاتے اور شوالے کے چاروں طرف ایک بھیڑ لگ جاتی۔ میرؔا کے بھجنوں میں سچّی محبت و عقیدت اور موسیقیت حد درجہ پائی جاتی ہے جو سننے والوں کے دل و دماغ میں کیف و سرور اور معرفتِ الٰہی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔

میرؔا کی شاعری قلبی واردات کی سچّی تصویر ہے۔ انقلابِ زندگی، دنیا کی بے ثباتی اور سوز و گداز ان کی شاعری میں رچا بسا ہے۔ ان کے ہر ہر لفظ سے غم و الم کا اظہار ہوتا ہے۔ میرؔا کی شاعری مکمل آہ ہے۔ اسے جو بھی سنتا ہے تڑپ جاتا ہے۔ میرؔا گیتوں اور بھجنوں کی ملکہ ہیں۔ ان کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ ان کی شاعری میں راجستھانی، گجراتی اور برج بھاشا کی خوبصورت آمیزش ہے۔ کہیں کہیں پنجابی، پوربی اور کھڑی بولی کا بھی عنصر نمایاں طور پر نظر آتا ہے لیکن مجموعی طور پر ان کی زبان برج بھاشا ہی مانی جاتی ہے اور اس میں سورداسؔ کے اسلوب کی خصوصیات نظر آتی ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ وہ سورداسؔ سے بے حد متاثر ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ایک جگہ کرشن جی کی سراپا نگاری سورداسؔ کے رنگ میں اس طرح کرتی ہیں۔

وَا مُوہن کے میں رُوپ لُبھانی
سُندر بدن کمل دَل لُوچن
بانکی چتون مَند مُسکانی
جَمُونا کے نیر تیر دِھینُو چراوے
بنسی میں گاویں میٹھی بانی

شری کرشن کی عبادت کا سلسلہ ہندی ادب میں وسیع ہے لیکن میرا بائی کی لافانی محبت کا جذبہ کرشن جی کی عبادت کی انوکھی مثال ہے۔ وِدّیا پتیؔ نے رادھا کے ذریعہ کرشن جی کی محبت کا انکشاف کیا ہے لیکن ان کی محبت میں حسنِ مجسّم کی جھلملاہٹ اور خواہش خاص طور پر جلوہ گر ہے۔ سورؔ کی محبت اور احساس میں انفرادیت کی کمی نظر آتی ہے۔ اس میں بھی رادھاؔ کا سہارا لینا پڑا لیکن میرا بائی کی محبت احساسِ نازک، شیریں محبت اور عورت کی زندگی کا حسین تجربہ سے لبریز ہے۔ محبت کی محویت، ملکوتی تبسّم اور احساس میرؔا بائی کو حاصل ہے وہ کہیں اور عمیر الحصول ہے۔

میرا بائی کی زندگی آنسوؤں سے لبریز ہے۔ عنفوانِ شباب میں ان کا سہاگ اُجڑ گیا۔ میرا بائی نے شاہی محلوں کے جاہ و حشم چھوڑ کر فراقِ عالم میں، جوانی کے ساگر کی لہروں میں، ناامیدی میں تیرتے ہوئے پھول سا بے چین ہو گیا اور راجکماری میرؔا اپنے مکمل اقتدار کو فراموش کر کرشن جی کے ''مُور مُکُٹ'' پر قربان کر کے خود بھکارن بن گئیں۔ ان کے دیدار کے لئے ان کی آنکھیں ہمیشہ آنسوؤں سے نم رہا کرتی تھیں۔ وہ کرشن جی کی پوجا میں ''پاؤں میں گھنگھرو'' باندھ کر رقص کیا کرتی تھیں۔

میرا بائی کی شاعری میں ہجر کے عالم میں زندگی کی ہمدردی عورت کے دل کی دھڑکن بن گئی۔ ان کی زندگی میں بے شمار جدائی کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیتا ہے۔ ہجر میں کئی ذہنی الجھنیں رونما ہوتی ہیں اور کئی رازِ دل، دردِ غم رونما ہوتے ہیں۔ میرا بائی نے اپنی شاعری میں ان سبھی تخیلات کا انکشاف کیا ہے۔

اس طرح میرا بائی عشق کی سچّی مغنیہ ہیں۔ ان کی شاعری میں محبت میں منہمک اور مجذوبیت کی مصوری ملتی ہے۔ جو انوکھا ہے۔ وہ سچی اپنے سانوریا کی دیوانی ہیں۔ جن کا دردِ محبت گیت بن گیا ہے۔ میرا بائی بالخصوص شری کرشن جی کی انوکھی محبوبہ ہیں۔ ان کی بھکتی کرشن جی کی سچی عبادت ہے لیکن ان کی شاعری میں اس وقت کے حالات کے زیر اثر ''ہٹھ یوگ سادھنا'' کی کچھ رازدارانہ خیالوں کی بھی مصوری ملتی ہے۔ کہیں کہیں ان کے جملوں میں نِرگُن سنتوں کی اصلاحی الفاظ بھی ملتے ہیں۔ میرؔا کے لبوں سے جو نغمہ نکلتا تھا وہ دوسروں کے دلوں میں کرشن جی کی محبت پیدا کرنے کے لئے ایک ایسا تیر تھا جو دل و جگر کے پار ہو جاتا۔ لوگ اسے مندر میں جاتے ہوئے دیکھ کر صدائے نغمہ کے لئے بے تاب ہو جاتے اور شوالے کے چاروں طرف ایک بھیڑ لگ جاتی جو میرؔا کی پوجا کو نہایت غور سے دیکھا کرتے اور اس کے نغموں میں کھو جاتے۔

شہنشاہِ ہندوستان ایک گدائے بے نوا کی طرح مندر میں داخل ہوا اور میرؔا کے دلگیر ترانوں کو سن کر ایسا خود رفتہ ہوا کہ اسے اپنی حیثیت کا بھی خیال نہ رہا۔ ابھی اس پر اسی سکتے کا عالم طاری تھا کہ میرؔا کی نظریں اس پر پڑیں اور اس کے اپنے پھٹے پرانے چیتھڑوں سے ایک بیش قیمتی مالا نکال کر کہا۔ ''اے محترم دیوی! اس حقیر تحفہ کو اپنے کرشن جی کے لئے قبول فرما''۔ میرؔا نے التجائیہ نظروں سے دیکھا اور اس مالا کو لیکر کرشن جی کے مُور مُکُٹ میں پہنا دیا۔ شہنشاہ اکبرؔ اپنے محل میں واپس چلا گیا۔ اسے کافی عرصہ تک میرؔا کے مترنّم آوازیں کانوں میں رس گھول رہی تھیں۔

میرؔا اپنے دل کے گریہ و زاری کو بیان کرنے کے لئے گاتی تھیں۔ وہ گاتی تھیں ان کو رونا تھا اور گریہ و زاری میں زبان کی کوئی اہمیت نہیں ہوا کرتی۔ اس لئے میرا بائی نے اپنی محبت کے درد کو ہی مخصوص درجہ دیا ہے۔ وہ اپنے درد کو ظاہر کرنا چاہتی ہیں۔ زبان چاہے جو بھی ہو اس کی انھیں فکر نہیں رہتی۔ اس لئے میرؔا کی شاعری میں راجستھانی، گجراتی اور برج بھاشا تینوں کے الفاظ ملتے ہیں۔ میرؔا نے عربی اور فارسی الفاظوں کا بھی استعمال کیا ہے۔

❑❑❑

ڈاکٹر نثار احمد

نوگام سمبل سوناوری، بندی پورہ، کشمیر

7889617356

قصیدہ نگاری کی زرخیز زمین: دبستانِ لکھنو

اردو میں قصیدہ نگاری کی روایت عرصۂ دراز سے قائم ہے۔تاریخ ادب اردو کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کوئی دور نہیں گزرا جس میں قصیدہ نہ لکھئے گئے ہوں۔ دکن کے بعد شمالی ہند میں لکھنو سرزمین ہندوستان میں ایک ایسا شہر ہے جس کی علمی و ادبی روایت صدیوں پر محیط ہے۔اس خاک سے ایسے گوہر نایاب اٹھے ہیں جن کی شہرت نے آسمان کو چھولیا ہے۔ یہ سرزمین زمانہ قدیم ہی سے اولیاء کرام کا مسکن ،علماء اعلام کا مرکز، اہل فن کا گہوارہ اور شعراء کا مولد رہا ہے۔غرض علوم کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جس میں یہاں کے باکمال فنکاروں کا حصہ نہ ہو۔اس شہر کی ادبی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔کہ یہاں کے ادباء وشعرا نے اردو شاعری اور نثر کے ساتھ ساتھ تحقیق ،تنقید میں ایسا وقیع سرمایہ چھوڑا ہے۔جس کو تاریخ کبھی بھی فراموش نہیں کرسکتی ہے۔جہاں تک قصیدہ گوئی کا تعلق ہے شعرائے لکھنو نے قصیدہ کو بھی اپنے اظہار کا وسیلہ بنا کر اپنی فنی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ صنف شمالی ہند میں اپنی ترقی کے دور سے گزر رہی تھی تو اسی دوران دہلی میں سیاسی حالات بگڑنے لگے جس وجہ سے سلطنت کا چراغ بجھنے لگا۔اس پرآشوب صورت حال کو دیکھ کر یہاں کے عوام وخواص نے اپنی جان بچانے کے لیے ملک کے دیگر حصوں کا رخ کیا۔چونکہ لکھنو اُس زمانے امن و امان کا گہوارہ تھا لہٰذا دہلی سے آنے والے عوام وخاص جنمیں شعراء بھی تھے لکھنو کے درباروں میں پہنچ گئے۔درباروں میں ان لوگوں نے جب اپنے ہنر دکھائے تو اُنھیں یہاں خوب پذیرائی ملی۔اس ضمن میں جس قصیدہ کو شاعر کو زیادہ شہرت ملی وہ مرزا محمد رفیع سودا ہے۔اگرچہ انہوں نے اپنی قصیدہ گوئی کا آغاز دہلی میں کیا۔لیکن لکھنو آنے کے بعد انہوں نے بیشتر قصائد یہاں کے امراو وزراء کی شان میں کہے ہیں جن میں شجاع الدولہ، نواب حسین رضا خان سرفراز دولہ، وغیرہ شامل ہیں۔سودا کے قصائد سے اردو قصیدہ نگاری کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ سودا وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے قصیدہ نگاری کو اپنی جولانی طبع سے عروج پر پہنچایا۔انہوں نے فارسی کے بڑے قصیدہ نگاروں کی تقلید کی اور ان کے قصیدوں کو اپنے لیے نمونہ بنا کر اردو میں قصیدے کا وقیع ذخیرہ چھوڑا ہے۔اس میں کوئی کلام نہیں کہ قصیدہ لکھنے کے لیے شاعر میں غیر معمولی صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے۔کیونکہ قصیدہ کا انداز بیان دوسرے اصناف سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ یہاں شاعر مختلف و متنوع موضوعات پر اظہار خیال کرتا ہے۔اس میں مضمون، آفرینی جوش بیان ،کلام کی بختگی ،شکوہ ِالفاظ، روانی وسلاست جذبات کا بیان، قادرلکلامی کے ساتھ ساتھ مشکل زمینوں میں شعر کہنے کی قدرت شامل ہوتی ہے یہ تمام خوبیاں قصائد سودا میں بدرجہ اتم موجود ہیں اس لیے سودا کو قصیدے کا نقاش اول اور فن قصیدہ نگاری کا امام کہا گیا ہے۔بقول محمد حسین آزاد:

> ”اول قصائد کا کہنا اور پھر اس دھوم دھام سے اعلی درجے کی فصاحت و بلاغت پر پہنچانا سودؔا کا کارنامہ ہے وہ اس میدان میں فارسی کے نامور شہسواروں کے ساتھ عناں درعناں ہی نہیں گئے بلکہ اکثر میدانوں میں آگے نکل گئے۔ان کے کلام کا زور وشور انوریؔ اور خاقانیؔ کو دباتا ہے اور نزاکت مضمون میں عرفی وظہوری کو شرماتا ہے“[۱]

سودؔا کے بعد لکھنو میں بہت سارے قصیدہ نگاروں نے قصیدے پر طبع آزمائی کی ہے۔ان میں انشاء اللہ خان انشاء، مصحفی، میرحسن، جرأت، رنگین، شیخ امداد علی بحر، خواجہ ارشد علی قلق، حاتم علی بیگ مہر، نواب علی خان سحر، سید محمد خان رند وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں سودا کے بعد مصحفی وہ شاعر ہیں جنھوں نے اردو قصیدہ کی ساخت کو قائم و دائم رکھا اور اپنے لاجواب انداز بیان سے زبان وادب کو وسعت دی۔موصوف نے تشبیب میں جدت طبع دکھائی ہے۔ان کے ہاں مختلف ومتنوع اقسام کے مضامین در آئے ہیں۔ مصحفی نہایت ہی زودگو اور بسیارنویس تھے۔انہوں نے قصائد کا ایک مکمل دیوان چھوڑا ہے۔جس میں قصائد کی مجموعی تعداد ۸۴ ہے۔انہوں نے حمدیہ، نعتیہ،

> ”بیسویں صدی عیسوی میں جہاں انسانی زندگی کے حالات وواقعات میں مختلف تبدیلیاں رونماں ہوئی ہیں، وہیں اس کے اثرات شعروادب میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ چونکہ اب درباری اور شاہی نظام کا خاتمہ ہوا۔اس لئے قصیدے میں بھی نمایاں تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔اس کی ہیت میں جو طوالت پہلے نظر آتی تھی اب وہ اختصار کی راہ پر گامزن ہوگئی ہے،اسلوب کے اعتبار سے بھی اب اس کے بیان میں سادگی کو ہی زیادہ اہمیت دی گئی۔اس طرح اب چونکہ شاہی دربار بھی نہیں رہے لہٰذا اکثر شعراء نے مذہبی قصائد لکھ کر اس کی ساخت کو برقرار رکھا۔ یہاں پر یہ کہنے میں مجھے کوئی تامل نہیں کہ مذہب نے صنف قصیدہ کی گرتی دیوار کو سہارا دے کر سنبھال لیا ہے۔ ورنہ اس کا وجود کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔ڈاکٹر عراق رضا زیدی کے الفاظ اس سلسلے میں بہت موزوں معلوم ہوتے ہیں۔“

اہلبیت کرامؑ کی مدح کے ساتھ ساتھ نوابین اور امراء کی مدح میں بھی بہت سے قصائد کہے ہیں ان قصائد کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ سنگلاخ زمینوں میں ہیں۔نمونے کے طور پر ایک نعتیہ قصیدہ کی تمہید کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

حنا سے ہے یہ تیری سرخ اے انگار انگشت
کہ ہو نہ پختہ مر جاں کی زنہیارانگشت
زبسکہ زشت ہے دنیا میں ہاتھ پھیلانا
رکھے ہے سمٹی ہوئی اپنی پشت خار انگشت
شمار داغ سے کب اتنی مجھ کو فرصت ہے
کہ رکھ سکوں بسرِ چشمِ اشکبار انگشت

درجہ بالا اشعار میں انگشت جیسی ردیف میں اشعار کہنا مصحفی کی قادر الکلامی کا ایک بین ثبوت ہے۔مشہور زمانہ مثنوی نگار میر حسن کی شہرت یوں تو ان کی شہرۂ آفاق مثنویوں سے ہے۔لیکن انہوں نے کچھ قصائد بھی کہے ہیں۔یہ قصائد انہوں نے آصف الدولہ سالار جنگ، سردار جنگ اور جواہر علی خان وغیرہ کی مدح میں کہے ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے چند قصائد در منقبت حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام کی میں کہے ہیں۔مثال کے طور پر حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام کی مدح میں قصیدہ کا یہ مطلع دیکھئے۔

نہ ہوئے حسن سے اس رو کے ہم عناں مہتاب
کہاں وہ پنجۂ خورشید اور کہاں مہتاب

ایک اور قصیدہ میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی مدح میں قصیدہ کا یہ مطلع دیکھئے۔

گلشن میں تونے جب سے رکھا ہے نگار پا
بیٹھے ہے باندھ رنگ سے گل کے بہار پا

میر حسن کے ہم عصر شعراء میں جعفر علی حسرت بھی ایک اہم نام ہے انھوں نے فیض آباد میں شجاع الدولہ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جس میں دربار شجاع الدولہ کی منظر کشی کی گئی ہے۔لکھنؤ میں قصیدہ نگاری کے فروغ میں خاندان عشق و تعشق ایک اہم نام ہے۔اس خاندان کے کئی ایسے جید شعراء ہیں جنہوں نے قصیدہ نگاری پر طبع آزمائی کر کے اس کی روایت کو فروغ دینے میں بیش بہا وگراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان شعراء میں عشق، تعشق، رشید، شدید اور مہذب لکھنوی وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں تعشق نے اپنے معاصرین میں ایک بڑا شاعر ہونے کا ثبوت اپنی قصیدہ گوئی سے بھی دیا۔موصوف نے اپنی زندگی کے اٹھارہ برس عراق میں گزارے ہیں۔اس دوران انہوں نے مختلف مقامات کا سفر کیا۔اس بات کی غمازی ان کے کئی قصائد بھی کرتے ہیں جو انہوں نے مختلف مقامات پر کہے ہیں۔مدینے میں قیام کے دوران انہوں نے وہاں کی دلکش و دل فریب آب وہوا سے متاثر ہو کر مناظر قدرت کی عکاسی کچھ یوں کی ہے۔

ریاض جناں ہیں نثار مدینہ
بڑے جوش پر ہے بہار مدینہ

اس طرح ایک اور قصیدے میں شہر نجف کی عظمت کو یوں بیان کرتے ہیں۔

جناں سے ہے اعلیٰ بہارِ نجف
الجھتے ہیں رضواں سے خارِ نجف
بنے گل چراغِ دیارِ نجف
بندھی ہے ہوائے بہارِ نجف
زہے وسعت و اقتدارِ نجف
پڑے ہیں فلک بھی کنارِ نجف
یہ آدم پہ ہے اختیارِ نجف
اٹھائے بٹھائے غبارِ نجف
کرم اے ہوائے دیارِ نجف

نعت اردو شاعری کا ایک اہم موضوع رہا ہے اس کے نقوش اردو شاعری کے ابتدائی دور سے ہی مختلف اصناف سخن میں نظر آتے ہیں۔مثنوی، مرثیہ، سلام اور رباعی کی طرح اردو قصیدے میں بھی نعت کا وافر ذخیرہ موجود ہے اس حوالے سے مختلف شعراء نے اس صنف کو قصیدے میں برتا ہے۔محسن کاکوری اسی قبیل کا ایک اہم نام ہے۔اگر یوں کہا جائے کہ محسن کے نعتیہ قصیدے سے صرف نظر کر کے اردو نعت گوئی کی تاریخ لکھنا محال ہے تو غلط نہ ہوگا۔موصوف کے نعتیہ سرمائے میں گلدستۂ رحمت، ابیاتِ نعت اور قصیدہ مدیح خیر المرسلین وغیرہ نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔محسن کا نعتیہ کلام لکھنوی طرز فکر کا آئینہ دار ہے کیونکہ شاعر نے صنائع بدائع، تشبیہات و استعارات، مضمون آفرینی اور رعایتِ لفظی پر زیادہ توجہ مرکوز کی ہے، جو اس بات کی غماز ہے کہ محسن میں نعت گوئی کی غیر معمولی صلاحیت موجود تھی۔اس کی اہم مثال قصیدہ خیر المرسلین ہے۔یہ قصیدہ ۱۴۳ اشعار پر مشتمل ہے۔تشبیب میں شاعر نے موسم برسات اور بہار کی مختلف کیفیات کا نقشہ ایسے دلفریب انداز میں کھینچا ہے کہ پڑھتے ہی شاعر کی قادر الکلامی کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔

سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے گھٹا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکل
جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طولِ امل
خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی قصیدے کی اس تشبیب کے حوالے سے یوں لکھتے ہیں۔

"ایسی نرالی تشبیب آپ کو اردو کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملے گی ذوق و سودا قصیدے کے بادشاہ ہیں لیکن ان کی تشبیب میں ایسی جدت اور زور نہیں"[۲]

نظم طباطبائی نے جہاں اردو نظم میں ہیئتی اور موضوعاتی تجربے کیے وہاں انہوں نے اپنی جدت طبع سے قصیدہ کو بھی روایتی انداز سے ہٹ کر پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ان کے تاریخی اور مذہبی قصائد زیادہ مشہور ہیں جہاں پر انہوں نے قصائد کی تشبیب میں تاریخ اسلام کے مختلف اہم واقعات اور غزوات کو بڑے ہی بلیغ انداز سے پیش کیا ہے۔قصیدہ غزوہ احزاب اسی قبیل کا ایک اہم قصیدہ ہے جس میں نظم طباطبائی نے دشمنوں کی فوج کے پہلوان کی مبارز طلبی پر حضرت علیؑ کا جنگ پر آمادہ ہونے کا واقعہ پیش کیا ہے۔

یہ سن کر قلب لشکر سے امیر المومنینؑ نکلے
الٹ لی آستین جھک کر عبا مولیٰ نے گر دانی
سلام آ کر کیا، رخصت ہوئے شاہِ رسالت سے
نبیؐ نے تیغ دی اور ساتھ کی تائید ربانی
بڑھایا جب قدم میدان کی جانب تو قدموں پر
تصدق ہوگئی شان و شکوہ و فرِ سلطانی
کہا داور نے ایسی زرہ میں نے نہیں دیکھی
سلیماں نے کہا جوشن ہے یہ نقشِ سلیمانی

اسی طرح اور بھی واقعات ہیں جہاں پر نظم طباطبائی نے اپنی قادر الکلامی کا بھرپور بھی ثبوت دیا ہے لہٰذا اگر ان کے قصائد کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو ان میں برجستگی، روانی اور تازگی بھی بدرجہ اتم نظر آتے ہیں۔اس کے علاوہ موصوف اپنی عالمانہ صلاحیت سے الفاظ کی خوبصورت اور برمحل استعمال پر بھرپور قدرت رکھتے تھے۔سید علی نقی صفی لکھنوی اپنے زمانے کے مشہور و معروف اساتذہ میں شمار کیے جاتے تھے۔اگرچہ ان کی شہرت زیادہ تر ان کی نظموں اور غزلوں سے ہے لیکن قصیدہ گوئی میں بھی انھیں اپنا ایک بلند مقام حاصل تھا۔انھیں اپنے دور کے بڑے قصیدہ گو شعراء میں یعنی محشر لکھنوی اور عزیز لکھنوی کے ساتھ قصیدہ گوئی کے عناصر ثلاثہ میں شمار کیا جاتا تھا۔

موصوف نے بہت سے قصائد کہے ہیں ان میں کچھ قصائد مخمس اور مسدس کی شکل میں بھی ہیں۔بقول علی جواد زیدی:۔

”صفی نے قصیدہ نگاری کے میدان میں طرز ادا کے اعتبار سے کئی جدتیں کی ہیں نظم کا بیانیہ انداز تسلسل،مضامین کا تنوع اور بیان کا وقار ان کے قصائد کے امتیازی نشانات ہیں“۔۳

بیسویں صدی عیسوی میں جہاں انسانی زندگی کے حالات وواقعات میں مختلف تبدیلیاں رونماں ہوئی ہیں،وہیں اس کے اثرات شعروادب میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔چونکہ اب درباری اور شاہی نظام کا خاتمہ ہوا۔اس لئے قصیدے میں بھی نمایاں تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔اس کی ہیت میں جوطوالت پہلے نظر آتی تھی اب وہ اختصار کی راہ پر گامزن ہوگئی ہے،اسلوب کے اعتبار سے بھی اب اس کے بیان میں سادگی کو ہی زیادہ اہمیت دی گئی۔اس طرح اب چونکہ شاہی دربار بھی نہیں رہے لہٰذا اکثر شعراء نے مذہبی قصائد لکھ کر اس کی ساخت کو برقرار رکھا۔یہاں پر یہ کہنے میں مجھے کوئی تامل نہیں کہ مذہب نے صنف قصیدہ کی گرتی دیوار کو سہارا دے کر سنبھال لیا ہے۔ورنہ اس کا وجود کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔ڈاکٹر عراق رضا زیدی کے الفاظ اس سلسلے میں بہت موزوں معلوم ہوتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں ہے:۔

”یہ مذہبی قصیدہ نگاری ہے جس نے آج بھی قصیدہ نگاری کو زندہ رکھا ہے۔عید میلادالنبیؐ کا موقع ہو یا چہاردہ معصومینؑ کی ولادت کی محافل یا گیارہویں شریف کے سلسلے کا میلاد ان سب میں آج بھی طرحی قصائد تحریر کئے جاتے ہیں۔جس سے قصیدہ نگاری کا فن زندہ ہے“۔۴

عزیزؔلکھنوی کے قصائد کا پہلا مجموعہ قصائد عزیز کے نام سے ۱۹۱۴عیسوی میں منصہ شہود پر آگیا ہے۔اب تک کی تحقیق کے مطابق ان کے قصائد کی تعداد ۵۷ ہیں قصائد کی تعداد کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو عزیز کا نام اردو کے عظیم قصیدہ نگاروں سودا اور ذوق کے بعد آتا ہے۔ان کے اکثر قصائد نعت اور منقبت پر مبنی ہے جو اس بات کی روشن دلیل ہے کہ انھوں نے مذہبی مضامین پر طبع آزمائی کر کے نہ صرف اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے بلکہ انھوں نے مذہبی شاعری کو فروغ دینے میں بھی اہم خدمات انجام دی ہیں۔

گہری نظر سے دیکھو تاریخ کو عرب کی
تھے کیسے کیسے ظالم فتنے اُٹھا نے والے
انسان تھے بہ ظاہر باطن میں تھے بہائم
دن رات بدعتوں کے طوفاں اُٹھا نے والے
تو نے بدل دیئے سب اخلاق ان کے آکر
تاریک جنگوں میں مشعل دکھانے والے

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ بیسویں صدی میں قصیدہ نگاری میں ایک بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ قصیدے کی تشبیب میں مضامین کی بوقلمونی جیسے بہاریہ،عاشقانہ،رندانہ،متصوفانہ فلسفیانہ اور ساقی نامہ وغیرہ مضامین نے ایک نئی ورح پھونک دی ہے۔اس حوالے سے مختلف شعراء نے ان مضامین کو اپنے قصائد میں برتا ہے محشرؔلکھنوی اسی قبیل کا ایک اہم نام ہیں۔ان کے قصائد کے دو مجموعے آفتاب محشر اور شفیع محشر منظر عام پر آچکے ہیں۔موصوف کے یہ قصائد نعت اور ائمہ معصومینؑ کی شان مبارک میں ہیں۔نمونے کے طور پر قصیدہ بہارِ بے خزان جو کہ ایک نعتیہ قصیدہ ہے کی بہاریہ تشبیب کے یہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

جواں معشوق کی صورت گھٹائیں جھومتی اٹھیں
مکدر ہوضیائے آئینہ روح سکندر سے
ہوا نے رفتہ رفتہ اعتدال ایسا کیا پیدا
ہوا کا فور آخر سوز باطن قلب اخگر سے
کیا شاداب ہر اک شئے کو اتنا فیض باراں نے
کہ بو آتی ہے تازے پھولوں کی پتھر کے جوہر سے

عزیزؔلکھنوی اور محشرؔلکھنوی کے بعد جن شعراء نے قصیدہ نگاری کی آبیاری کر کے اس کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کام کیا ان میں شارب لکھنوی،سالک لکھنوی،ناوک لکھنوی،سیدنواب افسر لکھنوی ،سید مہدی نظمی،جلال لکھنوی،مودب لکھنوی،سرفراز لکھنوی،اکمال لکھنوی،رفیق لکھنوی،صبالکھنوی اور مہذب لکھنوی وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔یہاں پر سردست طویل مباحث سے گریز کرتے ہوئے میں چند ایک شعراء کے نمونہ کلام کو پیش کرتا ہوں ملاحظہ کیجئے۔قصیدہ درمدح حضرت امام مہدی آخرالزماں علیہ السلام۔

آج گلزار کی نہروں میں نہیں آبِ حیات
یہ تو انسان کا لہو ہے جو رواں ہے ساقی
آج ذہنوں میں سلگتا ہے لطافت کا چمن
آج آنکھوں میں تمدن کا دھواں ہے ساقی
آج کے امن میں بھی جیسے مکدر ہے فضا
آج کا نغمۂ عشرت بھی فغاں ہے ساقی
سیدنواب افسرلکھنوی

اب قصیدہ درمدح امام زین العابدینؑ کے یہ چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

میری چشم تر میں ہر آنسو کا قطرہ قید ہے
دیکھیں ارباب نظر کوزے میں دریا قید ہے
خوف سے آنے نہ پائے جب زباں تک دل کی بات
ایسی آزادی مرے نزدیک گویا قید ہے
عشقِ عابدؑ میں ازل سے دل ہمارا قید ہے
دل سے ہم خوش ہیں ہمارے حسبِ منشا قید ہے
سیداکمال حسین لکھنوی

اب چند اشعار قصیدہ درمدحِ امام عصرؑ کی شان میں ملاحظہ فرمائیں۔

امامت کی لڑی میں آخری موتی نظر آیا
بڑوں کے جو مقابل ہے وہ چھوٹا سا گہر آیا
گل نرجس کے کھلنے سے مہک اٹھا جہاں سارا
زمانہ دوستوں کو گلشن جنت نظر آیا
تمہاری یادِ رخ میں جب فلک پر جاپڑیں نظریں
مہ کامل ہمیں چھوٹا سا اک تارا نظر آیا
ہچکی نزع کی کہتی ہے حسرت رہ گئی باقی
نہ تم آئے بلانے کو نہ کوئی نامہ بر آیا
سیدمحمدمیرزا مہذب لکھنوی

حواشی:

ا۔محمد حسین آزاد،آب حیات،کتابی دنیا دہلی،۲۰۱۴ء،ص ۱۳۰
۲۔ابولیث صدیقی،لکھنوکا دبستان شاعری،روشان پرنٹرس دہلی،۲۰۱۰ء،ص ۱۵۵
۳۔علی جواد زیدی،قصیدہ نگاران اتر پردیش،اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو،۱۹۷۸ء،ص ۲۲۰
۴۔قصیدے کی شعریات،شہپر رسول،وہاج الدین علوی،ص ۹۷،عرشیہ پبلیکیشنز دہلی،۲۰۱۸ء۔

□□□

حیدر رضا

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

6386151994

کاظم علی خان کی ادبی شخصیت

اردو ادب کی تاریخ شاہد ہے کہ دبستان لکھنؤ کا دائرۂ فکر محض شعر و شاعری تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ تحقیق و تنقید جیسی سنگلاخ زمین پر بھی محیط ہے۔ لکھنؤ کی سرزمین نے اردو ادب کو اہم محققین اور ناقدین بھی دیئے ہیں، جن میں ڈاکٹر اکبر حیدری، نیر مسعود، شارب ردولوی، پروفیسر محمود الحسن، پروفیسر انیس اشفاق اور پروفیسر مجاور حسین وغیرہ کے علاوہ کاظم علی خان کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ کاظم علی خان کی ادبی شخصیت اگرچہ ادب کی دنیا میں غیر مانوس رہی ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ادبی نقطۂ نظر سے ان کا کوئی مقام نہیں ہے۔ یہ ایک المیہ ہے کہ اردو قلم کاروں نے ان کی ادبی شخصیت پر زیادہ دھیان نہیں دیا لیکن مجھے امید ہے کہ زمانہ قریب ان کے ادبی کارناموں میں ضرور دلچسپی دکھائے گا۔

کاظم علی خان اپنے آبائی مکان 56 کٹرا ابوتراب خاں لکھنؤ میں 5/ جولائی 1938 کو پیدا ہوئے۔ ان کے والدین کا انتقال ان کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ کے لال باغ انٹر کالج اور گردھاری سنگھ انٹر کالج میں حاصل کی، پھر انٹرمیڈیٹ کا امتحان شیعہ کالج لکھنؤ سے پاس کیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے 1957 میں بی۔ اے اور 1958 میں بی ایڈ پاس کیا۔ 1973 میں کانپور یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ 1975 میں شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی میں بطور ریسرچ اسکالر داخلہ لیا اور بعنوان ''غالب کا ادبی شعور، نثری تصانیف کے آئینے میں'' تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ کاظم علی خان ابتدا میں تلک انٹر کالج (کوٹوا) الہ آباد اور التفات رسول انٹر کالج سندیلہ ضلع ہردوئی میں مدرس رہے۔ اس کے بعد 3/ اگست 1959 کو شیعہ انٹر کالج لکھنؤ میں ملازم ہوئے اور سبکدوشی کے بعد ایک طویل عرصے تک لکھنؤ یونیورسٹی شعبۂ اردو میں استاد کی حیثیت سے وابستہ رہے، 3 دسمبر 2012 کو انتقال ہوا۔ کاظم علی خان نے طالب علمی کے زمانے سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی چھوٹی بڑی تقریباً ڈیڑھ درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں سے دو کتابوں پر انھیں اتر پردیش اردو اکادمی کے انعامات سے بھی نوازا گیا۔ کاظم علی خان نے رثائی ادب کے حوالے سے نمایاں خدمات انجام دیں اور مرثیہ کی تحقیق و تنقید سے متعلق متعدد مضامین و کتابیں لکھی ہیں، ان کے ادبی کارناموں میں دبیرؔ اور غالبؔ سے متعلق تحقیقی مضامین ادبی اور علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے ہیں۔ ان کے مقالے متعدد رسائل اور اخبارات کے ادبی گوشوں میں شائع ہوئے جن اخبارات و رسائل میں ''آج کل نئی دہلی، غالب نامہ نئی دہلی، نیا دور لکھنؤ، ہماری زبان نئی دہلی، اکادمی لکھنؤ، نخلستان جے پور، خبر نامہ لکھنؤ، نوائے ادب بمبئی، اور شیعہ کالج میگزین لکھنؤ'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح انھوں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر متعدد ادبی پروگرام بھی پیش کئے جن کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔

کاظم علی خان ادبی حلقوں میں بڑی متحرک شخصیت کے مالک تھے اور وہ ادبی نشستوں میں نہایت سرگرمی سے شرکت کرتے رہے۔ محض شرکت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ادبی محفلوں کے انعقاد کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ وہ جب تک شیعہ کالج کی مدرسی پر مامور رہے مسلسل ادبی سیمیناروں، کانفرنسوں اور جلسوں کا باقاعدہ اہتمام کرتے رہے یہی سرگرمیاں ان کی شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کی وابستگی کے بعد بھی قائم رہیں۔ میرے خیال میں کاظم علی کی شخصیت کی تعمیر میں ان کے خاندانی ادبی ماحول کا خاص کردار رہا ہے، کہ ان کے خاندان اور خاندان انیسؔ کے درمیان گہرے دوستانہ تعلقات تھے، جو نفیسؔ کی وفات کے بعد بھی جاری رہے۔ ان کے والد نواب مرزا محمد ذکی علی خان نے میر نفیسؔ کے صاحبزادے اور خدائے سخن میر انیسؔ کے حقیقی پوتے دولہا صاحب عروج سے مرثیہ خوانی سیکھی تھی اور اس طرز کو کاظم علی خان بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی مرثیہ خوانی میں اپنائے ہوئے تھے۔ میر نفیسؔ کے صاحبزادے دولہا صاحب عروج مرحوم نے

> ''کاظم علی خان کی ادبی خدمات میں ان کی کتاب ''ادبی مقالے'' قابل ذکر ہے، یہ کتاب 1983 میں نامی پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی، جس میں ایک درجن سے زائد مقالے شامل ہیں، ان مقالوں میں جدید اردو مرثیے کے خدو خال - مراثی جوشؔ کے آئینے میں، حسرتؔ موہانی اور غالبیات، میرؔ اور لکھنؤ، مطالعہ ناسخ، آتشؔ کے بعض غیر معروف شاگرد، تلامذہ صباؔ لکھنوی، وغیرہ اپنے تحقیقی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے تحقیقی مضامین کا دوسرا مجموعہ ''تلاش دبیرؔ'' چودہ تحقیقی مضامین پر مشتمل اہم کارنامہ ہے جو نامی پریس لکھنؤ سے 1979 میں شائع ہوا جس میں بعض ایسے نئے نئے گوشے پیش کئے گئے ہیں جو مطالعہ دبیرؔ کے سلسلے میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً عکس خطوط دبیرؔ، عکس تحریر دبیرؔ، اور تصویر دبیرؔ کی شمولیت پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ یہ کتاب اتر پردیش اردو اکادمی سے انعام یافتہ بھی ہے۔''

ایک عرصہ تک کاظم علی خان کے خاندانی مکان میں سکونت بھی اختیار کی تھی۔ کاظم علی خان نے اپنے والد محترم کے استاد دولہا صاحب عروجؔ کے والد میر نفیسؔ کے کلام "انتخاب نفیسؔ" ادارہ تحفظ حسینیت سے 1965 میں شائع کرائی تھی۔ جو پانچ مراثی کا مجموعہ ہے۔ "اردو مرثیہ اور مرزا دبیرؔ" بھی 1965 میں شائع ہوئی۔

کاظم علی خان کی ادبی خدمات میں ان کی کتاب "ادبی مقالے" قابل ذکر ہے، یہ کتاب 1983 میں نامی پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی، جس میں ایک درجن سے زائد مقالے شامل ہیں، ان مقالوں میں جدید اردو مرثیے کے خدو خال - مراثی جوشؔ کے آئینے میں، حسرتؔ موہانی اور غالبیاتؔ، میرؔ اور لکھنؤ، مطالعہ ناسخ، آتشؔ کے بعض غیر معروف شاگرد، تلامذۂ صباؔ لکھنوی، وغیرہ اپنے تحقیقی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے تحقیقی مضامین کا دوسرا مجموعہ "تلاش دبیرؔ" چودہ تحقیقی مضامین پر مشتمل اہم کارنامہ ہے جو نامی پریس لکھنؤ سے 1979 میں شائع ہوا جس میں بعض ایسے نئے نئے گوشے پیش کئے گئے ہیں جو مطالعہ دبیرؔ کے سلسلے میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً عکس خطوط دبیرؔ، عکس تحریر دبیرؔ، اور تصویر دبیرؔ کی شمولیت پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ یہ کتاب اتر پردیش اردو اکادمی سے انعام یافتہ بھی ہے۔ ان کے تحقیقی مضامین کا تیسرا اہم مجموعہ "مقالات ونشریات" ہے۔ جو نظامی پریس لکھنؤ سے 1993 میں شائع ہوا۔ یہ سولہ مقالات اور پانچ نشریات پر مشتمل ایک اہم کتاب ہے۔ اس میں محمد حسین آزادؔ، امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، احمد جمال پاشا، واجد علی شاہ اور انشاؔ جیسی ادبی شخصیات پر مضامین شامل ہیں۔ مزید اس میں تحریک آزادی ہند اور لکھنوی ادب، یوپی میں لوک گیتوں کی روایت، لکھنوی تہذیب میں پہلے آپ کی روایت وغیرہ کے مختلف گوشوں کی مصنف نے سیر کرائی ہے۔

تحقیق کے میدان میں ان کی کتاب "تلاش وتحقیق" بھی قابل ستائش تحقیقی کارنامہ ہے یہ کتاب نظامی پریس لکھنؤ سے 1989 میں شائع ہوئی۔ جو پندرہ عدد تحقیقی مقالوں "فیض شخص اور شاعر، جوشؔ کی نثر نگاری، مراثی نسیمؔ امروہی کا تجزیاتی جائزہ، حدائق انظار پر غالبؔ کا دیباچہ، ناسخ کی غزل گوئی، باغ و بہار کے پلاٹ پر ایک نظر" وغیرہ پر مشتمل ہے۔

ان کے تحقیقی کاموں میں ان کی کتاب "کلاسیکی اردو ادب" کی اہمیت کی قدر اس اعتبار سے زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ کاظم علی نے اس کتاب میں ایسے اردو شعراء کی آخری آرام گاہوں کی معلومات درج کی ہیں جو اودھ کی سرزمین سے متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ ڈیڑھ درجن سے زائد شعراء پر مقالے بھی شامل کئے گئے ہیں جو اپنی تحقیقی معلومات کی نقطۂ نظر سے کافی اہم ہیں۔ اسی طرح انھوں نے اودھ کے شاہی خاندان کے فراموش کردہ ایک اہم شاعر آغا حجو شرفؔ کی شخصیت کا ادب میں تفصیلی تعارف کرانے کی غرض سے ایک کتاب بھی "آغا حجو شرفؔ" لکھی جو نظامی پریس لکھنؤ سے 1990 میں شائع ہوئی۔

مرزا غالبؔ سے متعلق ان کی دو کتابیں "توقیت غالبؔ" اور "خطوط غالبؔ تحقیقی مطالعہ" دستیاب ہوتی ہیں جو شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں۔ توقیت غالبؔ میں انہوں نے مرزا غالبؔ کی زندگی کے تمام چھوٹے بڑے واقعات تاریخی ترتیب کے ساتھ معتبر اور مستند ماخذ کے ساتھ پیش کئے ہیں اور دوسری کتاب "خطوط غالبؔ تحقیقی مطالعہ" میں کاظم علی خان نے مکتوب الیہ، تعداد رقعات، زمانۂ تحریر، خطوط کی مجموعی تعداد پر تحقیقی بحث کی ہے۔

درج بالا کتابوں کے علاوہ ان کی اہم کتابوں میں تنقیدی تجزیے (1972) اتر پردیش اردو اکادمی سے انعام یافتہ۔ مطالعہ تاریخ ادب ہندی (1973) اتر پردیش اردو اکادمی سے انعام یافتہ۔ غزلیت میرؔ کا تنقیدی جائزہ (1973)۔ سرسید اینڈ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (انگریزی) 1967۔ کاظم علی خان کی ترجمہ کردہ کتاب "سائنس اور سماج" ایجوکیشنل پبلشر دہلی 1998، مقدس نکلسن رائیڈر ہیگرڈ کے ایک انگریزی ناول کا اردو ترجمہ (1973) قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ترتیب وتدوین کے میدان میں بھی اہم کارنامے انجام دئے جن میں انتخاب صباؔ، انتخاب غزلیات ناسخ، انتخاب غزلیات جعفر علی خان اثرؔ، انتخاب نفیسؔ، انتخاب کلام حیرتؔ الہ آبادی وغیرہ اہم کتابیں ہیں۔

المختصر یہ کہ کاظم علی خان کی ادبی شخصیت خالص لکھنوی ماحول کی پروردہ ہے۔ جنھوں نے لکھنؤ کے ادبی ماحول میں رہ کر تحقیق وتدوین کے رموز سیکھے اور انہوں نے اردو تحقیق کی غیر مربوط کڑیوں کو جوڑنے کی کوشش کی جو تحقیق طلب دماغ کی محنت ومشقت کی خواہاں تھیں، انھوں نے اپنی تحقیقی اور تنقیدی بصیرت سے کام لے کر لکھنوی ادباء وشعراء سے متعلق نئے نئے گوشے تلاش کر کے اردو سرمایے کو مستند بنانے کی کوشش کی، اگر چہ انھوں نے متعدد اہم کارنامے انجام دیئے لیکن ان کی تصانیف تلاش دبیرؔ، خطوط غالبؔ تحقیقی مطالعہ، آغا حجو شرفؔ، انتخاب غزلیات ناسخ کو بعض تحقیقی خصوصیات کی بنیاد پر خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مکتوب میں ان کے عہد کے اہم محققین نے ان کو تعریفی کلمات سے بھی نوازا ہے۔ مثلاً قاضی عبدالودود کی رائے "تلاش دبیر" پر ملاحظہ ہو "کتاب آپ نے محنت سے لکھی ہے امید ہے آئندہ بھی آپ کو اس کا موقع ملتا رہے گا اسی طرح لکھتے رہیں"۔ ایک مکتوب میں مولا نا امتیاز علی خاں عرشی کچھ اسطرح رقم طراز ہیں کہ "دفتر ماتم پر آپ کا مقالہ پڑھا اور اس کو مفید اور دلچسپ پایا انشاء اللہ آپ بھی میدان تحقیق کے شہسواروں میں ممتاز مقام حاصل کریں گے"۔ اسی طرح کی متعدد آرائے محققین کاظم علی خان کی تحقیق کو مستند بناتی ہیں اور ان کے ادبی کارناموں کی تحقیق وطلب کا جواز ٹھہراتی ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کاظم علی خان اردو تحقیق وتدوین کی نظر انداز کی گئی ایک ایسی ادبی شخصیت ہیں جو سنجیدہ تحقیقی دماغ کی طلبگار ہے جو ان کے ادبی کارناموں کو اردو دنیا کے روبرو پیش کرے۔

معاون کتب:

۱۔ تلاش دبیرؔ، مصنف: کاظم علی خاں، ناشر: کاظم علی خاں، سن اشاعت: 1979

۲۔ آغا حجو شرفؔ، مصنف: کاظم علی خاں، ناشر: کاظم علی خاں، سن اشاعت: 1990

۳۔ خطوط غالبؔ تحقیقی مطالعہ، مصنف: کاظم علی خاں، ناشر: کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ، سن اشاعت: 1981

۴۔ کلاسیکی اردو ادب، مصنف: کاظم علی خاں، ناشر: ایرا ایجوکیشنل ٹرسٹ لکھنؤ، سن اشاعت: 2006

۵۔ مقالات ونشریات، مصنف: کاظم علی خاں، ناشر: کاظم علی خاں، سن اشاعت: 1993

❑❑❑

التماس

"ماہنامہ نیا دور" کو ارسال کیے جانے والے مضامین اور تخلیقات کا معیاری ہونا ضروری ہے اور مسودات کمپوز شدہ، مکمل ایڈریس، موبائل نمبر اور تصویر کے ساتھ ہونا لازمی ہے۔ ایسا نہ ہونے کی صورت میں اشاعت ممکن نہیں ہوگی۔

ادارہ--

محمد وسیم حسین بٹ
ڈاکٹر شیو یہ تر پاٹھی بریلی کالج، بریلی
7006266894

اردو میں نظریاتی تنقید: شارب ردولوی کے حوالے سے

حالیؔ کی ''مقدمہ شعروشاعری نے اردو کی نظریاتی تنقد'' کی جو داغ بیل ڈالی تھی اس کو صحیح معنوں میں وسعت دینے کا کام شارب ردولوی نے اپنی کتاب ''جدید اردو تنقید اصول ونظریات'' کے ذریعے کیا ہے۔ اردو تنقید کو بنیاد فراہم کرنے میں حالیؔ کا جو رول رہا ہے۔ جدید اردو تنقید کی شکل وصورت کا تعین کرنے میں اور اس کو مزید امکانات بخشنے میں وہی کردار شارب ردولوی کی تنقید ادا کرتی ہے۔ ترقی پسندی سے متاثر ہونے کے باوجود شارب ردولوی وسیع النظر اور وسیع الفکر نقاد رہے۔ اپنی اس غیر جانب داری کے باعث انہوں نے اردو میں سائنٹفک تنقید کی بنیاد ڈالی اور اسے تاثراتی کے بجائے معروضی نقطہ نگاہ عطا کیا۔ ان کی تنقید ادب، قاری اور سماج تینوں پہلوؤں کا مکمل احاطہ کرتی ہے اور تینوں اجزا کو وہ تنقیدی مطالع کے لئے لازم قرار دیتے ہیں۔ اپنی معتدل اور منصفانہ تنقید کے سبب شارب ردولوی اردو تنقید میں اعلیٰ مرتبہ رکھتے ہیں۔

''جدید اردو تنقید اصول ونظریات'' شارب ردولوی کا نظریاتی تنقید کے سلسلہ میں سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے اصول ادب سے لے کر تنقیدی نظریات تک تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بحث کی ہے اور اپنی رائے پیش کی ہے۔ انہوں نے اپنی اس کتاب میں بہت سارے ناقدوں کی وضع کردہ تعریفات کو بیان کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ خود بھی ادب کی تعریف پیش کی ہے۔ ان کی تنقید کا مطالعہ کرتے وقت اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ جب بھی وہ تنقید کے سلسلہ میں نظریاتی تنقید کا نام لیتے ہیں تو ان کے یہاں اس سے مراد کوئی مخصوص نظریہ تنقید نہیں ہے بلکہ نظریاتی تنقید کا لفظ وہ Theory یعنی اصول نِقد کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔

شارب ردولوی کے نزدیک ایک اچھا ادب وہ تھا جو اپنے عہد کی ہر طرح عکاسی کرتا ہو۔ انسانیت کی بھلائی اور عظیم انسانی قدروں کی ترجمانی بھی کرتا ہو۔ ان کے یہاں کسی بھی فن پارے کی قدر وقیمت کا تعین کرنے کے لئے معروضی انداز فکر کا ہونا ضروری ہوتا تھا۔ وہ ادب میں تہذیبی اور سماجی اہمیت کے قائل تھے۔ ان کے تجزیے میں اعتدال اور توازن بہت اعلیٰ درجہ کا ملتا ہے جس کی وجہ سے ان کی ادبی تنقید کی اہمیت مسلم ہے۔ ان کے لہجہ میں گھن گرج نہیں ہوتی۔ ایک منطقی ربط اور سلجھا ہوا انداز ہوتا ہے۔ وہ ترقی پسند اور سائنٹفک نظریہ تنقید کے قائل تھے۔ ان کے یہاں ماضی کا احترام ملتا ہے۔ وہ ادب کو انسانی زندگی میں ہونے والی ان عہد بہ عہد تاریخی، تہذیبی، سیاسی وسماجی تبدیلیوں کے پس منظر میں دیکھنے کی بھی کوشش کرتے ہیں جس کی وجہ سے ادب پارہ یا فن پارہ وجود میں آتا ہے۔ ان کے نزدیک ادب اپنے عہد کا آئینہ دار ہوتا ہے جس میں انسانی احساس کا پرتو ہمیں نظر آتا ہے۔ ان کی تنقید میں فرد کے اسی احساس کا ہر پہلو سے جائزہ لیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ادب عصری احساس کا آئینہ ہے اور عصری احساس میں فرد کا احساس بھی پوشیدہ ہے۔ اب تک جن صورتوں میں ادب کا مطالعہ کیا گیا ان میں کسی ایک حصے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ آفاقی قدروں اور عصری احساس پر یا جمالیات یا فرد کے احساس پر یہی وجہ ہے کہ جدیدیت اور ترقی پسندی کے درمیان ایک بڑی خلیج حائل ہوگئی ہے اس لیے ادبی تفہیم کے لیے اس وقت ایک فلسفیانہ اور سائنٹفک نقطۂ نظر کی ضرورت ہے۔''[۲]

شارب ردولوی مغرب ومشرق کے ادب کی مختلف جہتوں سے باخبر ہیں اور ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ ان کی ادبی زبان سادہ اور سلیس ہے اور تنقید میں سلاست پر وہ بہت زور دیتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کی تنقیدی کتاب ''جدید اردو تنقید اصول ونظریات'' ہر ایک طالب علم کے لئے آسان اور سہل معلوم ہوتی ہے اور اس کو پڑھنے میں طالب علم اچھی طرح محظوظ ہوتا ہے۔ ان کے یہاں الفاظ خوبصورت پرشکوہ اور رنگین نہیں ہوتے ہیں۔

> ''جدید اردو تنقید کا اکثر حصہ کسی نہ کسی شکل میں ترقی پسند تحریک کا مرہون منت ہے۔ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کی اہمیت مسلم ہے۔ اس تحریک نے ادب میں تجربات کی نئی راہیں کھولیں اور ادب اور زندگی کے رشتے کو استوار کر کے ادب کے افق کو ایسی جلا بخشی کہ اس میں سارا جہان سمٹ آیا۔ اسی تحریک نے پہلی بار حقیقت اور واقعیت، داخلیت وخارجیت، عوامی اور غیر عوامی ادب کے مباحث کی ابتدا کر کے ذہن وفکر کے دریچوں کو کھولا۔ ترقی پسند تحریک کے ناقدین کی ایک بڑی جماعت ادب کی تفہیم اور پرکھ ترقی پسند نقطۂ نظر ہی سے کر رہے تھے۔ ترقی پسند تحریک کے ادیب ہمیشہ تنقیدی تجزیے میں نئے تجربات اور نئے خیالات سے فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔''

شارب ردولوی جدید دور کے ان اہم ناقدوں میں سے ہے جنہوں نے اپنی بیشتر توجہ اصول تنقید کو متعین کرنے میں صرف کی۔ یہ کام آسان نہیں تھا اس لئے کہ ترقی پسند تحریک کے فروغ کے ساتھ جس طرح مغربی تنقیدی دبستانوں کے اثرات اردو تنقید پر پڑے، انہوں نے اس کام کو خاصہ دشوار بنا دیا۔ وہ کسی بھی کتاب کو جب تنقید کے دائرے میں پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس بات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں کہ اس فن پارے کے حسن اور عیب کا صحیح صحیح اندازہ لگا کے، اس کی جانچ و پرکھ اور اس کی قدر و قیمت کا کس طرح تعین کرنا چاہیے کیونکہ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت وسیع تھا۔ وہ کسی بھی فن پارے کے مطالعہ کے وقت اس کی تہہ تک جاتے ہیں اور اس کی اصل ماہیت اور مقصد کو سمجھنے پر زور دیتے ہیں اور اس حقیقت کو اس فن پارے سے اخذ کرنے کے بعد اپنا قلم اس کی طرف اٹھاتے ہیں۔

شارب ردولوی سید احتشام حسین کے بعد آنے والے ناقدوں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جن کی تنقید فکری اور نظریاتی طور پر ترقی پسند نظریے سے منسلک تھی۔ انہوں نے تنقید میں ترقی پسند نقطۂ نظر کے اصولوں کو مرتب و متعین کرنے کی پوری سعی کی۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے ساتھ ساتھ اردو کے کلاسکی ادب اور دیگر جدید ادبی تحریکوں سے بھی ان کی گہری وابستگی رہی ہے۔ انہوں نے ادبی تنقید کے اصول و نظریات سے جامع بحث کی ہے۔ شارب ردولوی کی اہم تصانیف، جدید اردو تنقید اصول و نظریات" "تنقیدی مطالعے"، "تنقیدی مباحث"، " جگر فن اور شخصیت" اور" ترقی پسند شعری فکر" وغیرہ کی تحریروں سے ان کی نظریاتی اور عملی تنقید پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ اپنی کتاب" جدید اردو تنقید اصول و نظریات" میں اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کسی تنقیدی نظریے کے بغیر ادبی تخلیق کا مطالعہ مشکل ہے:

"کسی نظریے کے بغیر ادب کا مطالعہ تو مشکل ہے ہی اس کے ساتھ ہی نقاد کے تصورات کو بھی سمجھنے میں دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ ایسی تحریروں میں کبھی کبھی تضاد پیدا ہو جاتا ہے اس کے مطالعہ کا یا تو کوئی اصول نہیں رہتا یا داخلی کیفیت کی ترجمانی پر بہت زور ہو جاتا ہے اور نقاد تنقید کا سارا کام کسی اصول کے بجائے زبان کی رنگینی اور تحریر میں شاعرانہ دلکشی سے لینا شروع کر دیتا ہے۔ ایسی صورت میں ادب کے ایک عام قاری کے لیے جو کسی فنی تخلیق کی خوبیوں اور خامیوں کو سمجھنا چاہتا ہے مشکلیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایسے مضامین کو پڑھ کر وہ کوئی اصول نہیں بنا پاتا جن کو سامنے رکھ کر وہ ادب کا مطالعہ کرے۔"۳؎

شارب ردولوی کے نزدیک ایک عام قاری کو کسی ادیب کی داخلی کیفیات کے ساتھ خارجی عوامل سے آگہی بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ادب کا جامع مطالعہ ممکن نہیں ہے۔ ہر ایک ناقد نے ادب کی تعریف اپنے اپنے نظریات کے آئینے میں کی ہے۔ کسی نے ادب کو سماج کا آئینہ کہا ہے تو کسی نے تنقید حیات، کسی کے یہاں ادب فن لطیف ہے، تو کسی نے ادب کو تفسیر حیات سے تعبیر کیا ہے اور کسی نے ادب کا مقصد صرف مسرت بہم پہنچانا بتایا ہے۔ لیکن شارب ردولوی کے یہاں ادب زندگی اور تہذیب کا آئینہ ہے۔ وہ ادب کو خیالات و جذبات کے اظہار کا نام بھی دیتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس کو تغیر پذیر سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ادب انسان کے خیالات و جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ اور اس کے خیالات و جذبات کی بنیاد تجربات پر ہوتی ہے۔ جب ہم ادب کے لئے یہ بات کہتے ہیں تو اس کا سلسلہ زندگی اور اس کے مادی حالات اور عوارض سے مل جاتا ہے۔ کیونکہ بقول فیرل" ادب اور فن کا ارتقاء خلا میں وجود رکھنے والا خود مختار عمل نہیں ہے"۔ یعنی فنکار اپنی تخلیق خلا میں نہیں کرتا۔ اس کی تخلیقات انہیں روایات اور سماجی ماحول سے وابستہ ہوتی ہیں جن میں وہ سانس لیتا ہے۔ جن حالات سے اس کی زندگی دو چار ہوتی ہے اس کے نقوش خالات کے ذریعے ادب میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔"۴؎

ایک جگہ وہ اور لکھتے ہیں:

"ادب انسان کے خیالات و جذبات کا اظہار ہے لیکن ادب ساکن و جامد تصورات کا اظہار نہیں بلکہ وہ لمحہ لمحہ بدلتے ہوئے معاشرتی نظام تہذیبی اقدار اور سماج کے ارتقا کا ایک جزو ہے۔"۵؎

"جدید اردو تنقید اصول و نظریات" نظریاتی تنقید کا اردو ادب میں بہترین سرمایہ ہے جس میں ادب کی کئی لہریں ایک ساتھ رواں دواں دکھائی دیتی ہیں۔ اس میں ادب کی حقیقت و ماہیت، قدیم یونانی و مشرقی نظریات و تحریکات، کلاسیکی و نو کلاسیکی تحریکوں اور تنقید کے مختلف اسالیب نقد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہیں تصوف، شاہ ولی اللہ اور وہابی تحریک، بھگتی تحریک اور علی گڑھ تحریک کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اور اسی طرح رومانی و نفسیاتی تنقید، جمالیاتی و تاثراتی تنقید، تاریخی و مارکسی تنقید کے ساتھ تنقید کے جدید مغربی اصول و نظریات پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور یہ پتہ لگانے کی سعی کی گئی ہے کہ ادب کے تجزیہ و تفہیم کے لئے تنقید کا کون سا پیمانہ زیادہ معاون ثابت ہوگا۔

ادب کیا ہے؟ اس کی کوئی بھی ایک مکمل اور جامع تعریف کرنا آسان کام نہیں ہے۔ مختلف ناقدین نے ادب کی بے شمار تعریفیں پیش کی ہیں جو اکثر ایک دوسرے سے مختلف ہے، اسی ضمن میں شارب ردولوی ادب کے متعلق اپنا خیال یوں پیش کرتے ہیں:

ادب دراصل زندگی اور تہذیب کا عکاس ہوتا ہے۔ وہ سماج اور زندگی کی خارجی حقیقتوں کو داخلی آئینے میں پیش کرتا ہے۔ ادب انسانی زندگی کی ایک ایسی تصویر ہے جس میں انسانی جذبات و احساسات کے علاوہ مشاہدات و تجربات اور خاالات کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اس لئے ادب میں تاریخی حقیقت، زندگی کا سچا تصور اور فن کے صحیح احساس و تصورات کا پایا جانا نہایت ضروری ہے۔"۶؎

شارب ردولوی کو تنقید سے دلچسپی طالب علمی کے زمانے سے ہی تھی اور ان کو اس بات کا احساس بھی تھا کہ" مقدمہ شعر و شاعری" کے بعد سے اردو میں تنقید کی سینکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہماری بدقسمتی ہے کہ تنقیدی اصول اور مسائل پر حالی کے بعد کسی نے باقاعدگی سے کام نہیں کیا۔ اور وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اب تک جتنا بھی کام ہوا ہے وہ عملی تنقید سے متعلق ہوا ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جنہوں نے اپنے مضامین میں ادبی مطالعہ کے اصول و نظریات سے بحث کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"تنقید سے مجھے اپنی طالب علمی کے زمانہ ہی سے دلچسپی تھی اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں بھی جب میں نے تحقیق کا کام کرنے کا ارادہ کیا تو میرے لئے اصول تنقید ہی کا موضوع طے کیا گیا۔"۷؎

وہ طالب علمی کے زمانہ سے ہی ایک آزاد خیالی کے حامل تھے۔ وہ اپنے خیالات و نظریات کے اظہار میں ذرا بھی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیتے اور اسی بے باکی اور بے خوفی کی وجہ سے انھوں نے ابتدا ہی سے اپنی الگ شناخت قائم کی ہوئی تھی۔" جگر فن اور شخصیت" کے مقدمہ

میں انہوں نے تنقید کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

''تنقید میرے خیال میں نہ تو عیب جوئی ہے اور نہ قصیدہ خوانی بلکہ ایک حد تک تخلیقی کام ہے جو ادیب یا شاعر کے کارناموں کی صحیح حیثیت متعین کرتی ہے۔ نقاد کا کام شیشہ گری سے زیادہ نازک اور خضر کی رہنمائی سے زیادہ ذمہ داری کا کام ہے۔ نقاد کا غیر جانبدار رہنا اس کا اولین فرض ہے ورنہ وہ صحت مند عملی تنقید کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا نہیں ہوسکتا۔۔۔۔۔ میں نے جگر صاحب کے فن اور ان کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے اسی اصول کو پیش نظر رکھا ہے۔۔۔۔۔میں نہ تو کلیم الدین احمد، عندلیب شادانی اور بعض دوسرے نقادوں کی طرح جگر کو یک قلم شاعر ماننے سے انکار کیا ہے اور نہ ہی ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور بعض دوسرے لوگوں کے نظریئے کے مطابق انھیں اس صدی کا عظیم ترین شاعر ثابت کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ ساری باتیں تاثراتی، جذباتی اور انتہا پسندی کی ہیں۔''۸

جدید اردو تنقید کا اکثر حصہ کسی نہ کسی شکل میں ترقی پسند تحریک کا مرہون منت ہے۔ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کی اہمت مسلم ہے۔ اس تحریک نے ادب میں تجربات کی نئی راہیں کھولیں اور ادب اور زندگی کے رشتے کو استوار کرکے ادب کے افق کو ایسی جلا بخشی کہ اس میں سارا جہاں سمٹ آیا۔ اسی تحریک نے پہلی بار حقیقت اور واقعیت، داخلیت و خارجیت، عوامی اور غیر عوامی ادب کے مباحث کی ابتدا کرکے ذہن وفکر کے دریچوں کو کھولا۔ ترقی پسند تحریک کے ناقدین کی ایک بڑی جماعت ادب کی تفہیم اور پرکھ ترقی پسند نقطۂ نظر ہی سے کر رہے تھے۔ ترقی پسند تحریک کے ادیب ہمیشہ تنقیدی تجزیے میں نئے تجربات اور نئے خیالات سے فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ شارب ردولوی اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

ادب کا تعلق جذبہ واحساس سے ہے اور جذبہ یا احساس کوئی جامد شے نہیں ہے اس لیے ادب کو پرکھنے کے اصول بھی جامد اور بے لوچ نہیں ہو سکتے۔ ترقی پسند ناقدین نے ہمیشہ اس بات کو پیش نظر رکھا اور تنقیدی تجزیے میں نئے علوم اور نئی باتوں سے استفادہ کیا ہے۔ اس دور کے ناقدین نئی ترقی پسندی کے معمار ہیں جن کے تجزیے کی ہمہ جہتی ان کی تنقید کو سائنٹفک اور ادبی تفہیم کے لیے زیادہ قابل قبول بناتی ہے۔''۹

ادیب یا تخلیق نگار اپنے عہد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جس معاشرے میں وہ سانس لے رہا ہے۔ انسانی ذہن خود بہ خود شعوری یا لاشعوری طور پر اپنے آس پاس کے حالات جن سے وہ گزر رہا ہے اس کے تاثرات کو ضرور قبول کرلیتا ہے۔ اس لیے کسی بھی ادیب کی تخلیق خواہ وہ نثر ہو یا نظم اس کے عہد کی عکاسی کرتی ہیں۔ شارب ردولوی ادب کو محض دل بہلانے اور لطف اندوزی کا وسیلہ نہیں مانتے بلکہ وہ اس میں اپنے عہد کی ان قدروں کو محسوس کرتے ہیں جس سے ادیب متاثر ہوا ہو۔ اس لئے وہ ادب کو اپنے عہد کی سماجی تاریخ سے تعبیر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''ادب اپنے عہد کے عقائد اور تعصبات سے متاثر ہوتا ہے وہ سماجیات اور تاریخ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے عہد کی سماجی تاریخ ہوتا ہے۔ وہ صرف تعین کا ذریعہ نہیں۔ اس میں جھانک کر کسی بھی عہد کی رائج قدروں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اردو شاعری میں اظہار و بیان کی متانت اور احتیاط ان تہذیبی ضابطوں اور پابندیوں کی نشاندہی کرتی ہیں جو اس سرمایہ دارانہ سماج میں رائج تھیں جہاں محبت بالاخانوں پر تو پھل پھول سکتی تھی لیکن گھر کے آنگن اور دالانوں میں اس کا اظہار ممنوع تھا۔''۱۰

شارب ردولوی نے انسانی زندگی اور ادب کے درمیان مربوط رشتے پر بھی اپنا اظہار خیال کیا ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ادب کا سماج سے رشتہ استوار کرنے کا مقصد ومطلب یہ نہیں ہے کہ اسے سماج کی پابندیوں کا تابع قرار دیا جائے بلکہ ادب پارے میں پوشیدہ اس گہرائی اور حقیقت وصداقت کی نشاندہی کرنا ہے جس سے فنکار وادیب کو قوت میسر ہوتی ہے۔ ادیب یا فنکار بھی سماج کا اہم فرد ہوتا ہے اور یہ بات بھی عیاں ہے کہ سماج پر ہونے والی تبدیلیوں سے وہ متاثر ہوتا ہے۔ اسلئے ادب اور سماج کے درمیان جو رشتہ ہے اس سے کسی کو قطعی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ وہ تنقید کی اہمیت کے قائل ہیں۔ کیوں کہ ادب کے علم کی آگہی سے فن پارے کی اہمیت وافادیت اور فنی اقدار کے تعین کا حق محض تنقید ہی ادا کرسکتی ہے۔ شارب ردولوی اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

''ادبی مسائل کو سمجھنے کے لیے صرف ادب کا علم کافی نہیں کیونکہ صرف ادب کی واقفیت سے کسی فن پارے کی تشریح تو ہوسکتی ہے، اس بارے میں بعض معلومات تو ہوسکتی ہے لیکن ذخیرہ ادب میں اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ تنقید کسی ادب پارے کے سلسلے میں معلومات بھی فراہم کرتی ہے، تشریح بھی کرتی ہے، تجزیہ بھی اور تاریخ، نفسیات، جمالیات، تہذیب و معاشرت کے اثرات کی روشنی میں اس کے فنی اقدار کا تعین بھی۔''۱۱

اصناف نظم ہوں یا نثر ان کے مطالعے کے لیے وہ چند خاص باتوں پر زور دیتے ہیں مثلاً:

(۱) متن کا مجموعی مطالعہ (۲) اصناف کے اپنے مطالبات (۳) فن کی جمالیاتی قدریں (۴) اظہار و بیان پر قدرت (۵) عصری مطالبات سے مطابقت۔ اس طرح شارب ردولوی کا تنقیدی نظریہ ایک ایسا نظریہ بن جاتا ہے جو ادبی تفہیم کے تمام مطالبات کا احاطہ بخوبی کرلیتا ہے۔

شارب ردولوی نے اپنی تصانیف کا کام طالب علمی کے زمانے سے ہی شروع کردیا تھا اور تاحیات اس کام میں مصروف رہے۔ انہوں نے تنقید وتحقیق کی باریکیاں سمجھنے اور سمجھانے میں اپنی زندگی صرف کردی۔ ان کی تنقیدی بصیرت میں رفتہ رفتہ جو بھی تیزی آئی وہ ان کے ذوق مطالعہ کی مرہون منت ہے۔ طالب علمی کے زمانے سے لے کر وہ آخر عمر تک تصنیف وتالیف کے کام میں منہمک تھے۔ ان کی ادبی کاوش وادبی خدمات کو اردو دنیا میں کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

حواشی

۱۔شارب ردولوی: جدید تنقید: قدر اور نظریہ، تنقیدی مطالعے، نصرت پبلشر، لکھنؤ، 1984، ص15۔

۲۔شارب ردولوی: جدید اردو تنقید اصول ونظریات، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1994، ص396۔

۳۔شارب ردولوی: جدید اردو تنقید اصول ونظریات، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1994، ص343۔

۴۔شارب ردولوی: جدید اردو تنقید اصول ونظریات، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1994، ص344۔

۵۔شارب ردولوی: جدید اردو تنقید اصول ونظریات، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 2015، ص30۔

۶۔شارب ردولوی: جدید اردو تنقید اصول ونظریات، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1994، ص14۔

۷۔شارب ردولوی: جگر فن اور شخصیت، شاہین پبلیشرز سرائے گڑھا الہ آباد، 1961، ص10۔

۸۔ شارب ردولوی: ترقی پسند تحریک اور اردو تنقید، تنقیدی مباحث، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1995، ص49۔

۹۔شارب ردولوی، : کیفی اعظمی کا شعری سفر، تنقیدی مباحث، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1995، ص138۔

۱۰۔شارب رودلوی: تنقیدی مباحث، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1995، ص113۔

❑❑❑

زبیدہ نسیم

ریسرچ اسکالر، دہلی یونیورسٹی، دہلی

9622565425

”ناگہانی“ زمیندارانہ نظام میں خانگی عورتوں کا مربوط بیانیہ

اردو لغت میں ”ناگہانی“ کے لفظی معنی، اچانک پیش آنے والا، دفعتاً واقع ہونے والا، یکا یک رونما ہونے والا سانحہ، وغیرہ کے ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں جب اردو فکشن ایک نئی راہ پر گامزن تھا اس زمانے میں سب سے بڑا قافلہ بہار کے فکشن نگاروں کا تھا۔ اس زمانے منظر عام پر آنے والے افسانہ نویسوں اور ناول نگاروں نے اپنے عہد کے فنی وفکری مسائل پر توجہ اور رائج رویوں سے کسب فیض کرتے ہوئے ایسی تخلیقی کائنات آباد کی جس سے اردو فکشن کی آبرو کو اور بھی اعتبار حاصل ہوا۔ ان فکشن نگاروں میں ایک اہم نام حسین الحق کا بھی ہے۔ حسین الحق نے اپنے افسانوی سفر کی ابتداء دہلی سے شائع ہونے والے ہفتہ وار اخبار ”تیج“ کے ۱۹۶۹ء کے ایک شمارے سے کی جس میں انہوں نے اپنا افسانہ ”جیسے کو تیسا“ شائع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جدیدیت کے طلسم نے اردو ادب پر اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔ حسین الحق کے افسانے جدیدیت اور مابعد جدیدیت دونوں رجحانات کا بخوبی احاطہ کرتے ہیں۔ انہوں نے مختصر اور طویل دونوں طرح کے افسانے لکھے۔ نئے تجربوں کے ساتھ کہانی کو برقرار رکھنا حسین الحق کا کمال ہے اور یہی ایک بلند پایہ افسانہ نگار اور فنکار کی پہچان ہوتی ہے۔ حسین الحق کی افسانہ نگاری کے متعلق عبدالصمد اس طرح رقمطراز ہیں:

> ”افسانہ لکھنے کی شروعات انہوں نے روایتی ڈھنگ سے کی مگر جب جدیدیت کا علم بلند ہوا تو اس کے پرزور حمایتی بن گئے اور ”شب خون“ اور دوسرے جدید رسالوں میں تواتر سے چھپنے لگے۔ لیکن کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں وہ روش اختیار نہیں کی جو انہیں نئے معاشرے کا تنہا آدمی، اپنے خول میں بند انسان، نام نہاد صنعتی ترقی سے بیزار اور اس کی مبینہ زہرناکیوں سے آلودہ، شکستہ، دوسروں سے نہیں صرف اور صرف اپنے آپ کے لئے لکھنے والا فن کار وغیرہ وغیرہ ثابت کرتے، انہوں نے علامتی اور تجریدی افسانے ضرور لکھے مگر ان کے یہاں ترسیل کبھی مسئلہ نہیں بنی۔ جدیدیت کے عروج پر ان کا ایک افسانہ ”بارش میں گھرا مکان“ رسالہ شب خون میں شائع ہوا تھا۔ اس افسانے نے نہ صرف ان کی ادبی شخصیت کی پہچان مستحکم کی بلکہ اس نے ہندو پاک سطح پر سنجیدہ لکھنے پڑھنے والوں نیز جینوئن قاری کو ان کی طرف متوجہ کیا۔ یوں حسین الحق اس افسانے کو اپنا شاہکار افسانہ تسلیم نہیں کرتے، پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ افسانہ تو بہر حال ان کے قلم سے ہی نکلا ہے۔ ویسے وہ ایک ایسا افسانہ ہے جس کی لیک پر بشمول حسین الحق بے شمار افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے۔ حسین الحق کے پاس ناولوں اور افسانوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے مگر کہیں بھی اس پر جدیدیت حاوی ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ پھر بھی حسین الحق کے جدید ہونے پر آج اصرار ہے اور وہ ترقی پسند مصنفین کے حامیوں میں اپنا نام درج کرا چکے ہیں اور اس کے عہدہ دار بھی رہے ہیں“۔ ۱

حسین الحق جتنے کامیاب ناول نگار ہیں اتنے ہی ممتاز افسانہ نگار بھی ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے (۱) پس پردہ شب (۲) صورت حال (۳) بارش میں گھرا مکان (۴) گھنے جنگلوں میں (۵) مطلع (۶) سوئی کی نوک پر رکا لمحہ (۷) نیو کی اینٹ وغیرہ منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کا ساتواں افسانوی مجموعہ ”نیو کی اینٹ“ ہے جو بیس افسانوں پر مشتمل ہے ان بیس افسانوں کے عنوانات حسب ذیل ہیں: ناگہانی، مور پاؤں، سبحان اللہ، احمد مردہ راڈرا، جلیبی کارس، زندگی اے زندگی، آشوب، نجات، کوئی نجات، بچاؤ بچاؤ، کب ٹھہرے گا درد اے دل، استعارہ، جلتے صحرا میں، ننگے پاؤں رقص، کہا سے میں خواب، گونگا بولنا چاہتا ہے، لڑکی کو رونا منع ہے، غم ذرہ، یہ آدمی، رام نگر کے رستے میں اور نیو کی اینٹ درج ہیں۔ ”ناگہانی“ اس افسانوی مجموعے کا پہلا افسانہ ہے۔

> ”بی بی عزت النساء کی شادی ایک ایسے بگڑے ہوئے اور بدمزاج زمیندار سے ہو جاتی ہے جس کے مزاج میں وحشت اور درندگی ہے۔ جلال الدین کے اندر ایک ایسا وحشت ناک درندہ صفت شوہر چھپا بیٹھا تھا جو عام لمحات کی بات تو الگ رہی خلوت میں بھی اذیت کے نئے حربے تلاش کرتا رہتا تھا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عزت النساء کی زندگی کس طور پر گزر رہی ہوگی۔ جلال الدین کا سارا کاروبار ان کا خاندانی منشی بنسی دھر پرشاد سنبھالتے تھے ان کا حال یہ تھا کہ ڈیوڑھی پر جب آتے تو وہ احترام یا خوف سے ڈیوڑھی کے باہر جوتی اتار دیتے اور دھوتی کھول کر لنگی بنا لیتے اور ان کی یہ مجال نہ ہوتی کہ وہ اپنی آمد کی خبر اندر بھجوا سکیں وہ تب تک بیٹھے رہتے جب تک انہیں جانے کی اجازت نہیں مل جاتی، یہ سلسلہ تقریباً آٹھ سال تک چلتا رہا اور اچانک جلال الدین پر فالج کا حملہ ہوتا ہے جس نے صرف اس کو ہی نہیں بلکہ پورے گھر کو فالج زدہ بنا دیا تھا“

اس افسانوی مجموعے میں شامل بیس کہانیوں کا الگ الگ پس منظر ہے۔لیکن کچھ کہانیاں ایسی بھی ہیں جن میں خاص طور پر عورتوں کے اس درد کو محسوس کرنے کی کوشش کی گئی ہے جیسے وہ اپنے وجود کی تاریکی اور تنہائی میں گھونٹ گھونٹ پینے پر مجبور ہوتی ہیں۔''نیو کی اینٹ'' میں شامل افسانہ''ناگہانی'' کا انتخاب میں نے اس لئے کیا کیوں کہ یہ افسانہ خواتین کے متعلق از سر نو غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔

سولہ صفحات پر مشتمل اس افسانے میں چار کردار شامل ہیں۔مرکزیت بی بی عزت النساء کو حاصل ہے۔ضمنی کرداروں میں شوہر جلال الدین اور لالہ بنسی دھر پرشاد ہیں۔''ناگہانی'' بنیادی طور پر زمیندارانہ نظام کے اندر جنم لینے والے ایسے طبقہ کو اپنے مطالعہ ومشاہدہ کا مرکز بناتی ہے جو ظاہری نظر نہیں آتا مگر بہر حال یہ طبقہ موجود تھا۔جس سے مراد سماجی ڈھانچے میں موجود''خانگی'' طبقے سے ہے۔

''ناگہانی'' ایک خوبصورت اور لطیف بیانیے کی حامل کہانی ہے جس میں نظام کے تہہ و بالا ہونے اور نظام کے اندر سانس لینے والوں کے آہستہ آہستہ اور اندر ہی اندر ٹوٹتے اور مرتے رہنے کا ایک افسوس ناک سلسلہ جاری ہے۔

بی بی عزت النساء کی شادی ایک ایسے بگڑے ہوئے اور بدمزاج زمیندار سے ہو جاتی ہے جس کے مزاج میں وحشت اور درندگی ہے۔جلال الدین کے اندر ایک ایسا وحشت ناک درندہ صفت شوہر چھپا بیٹھا تھا جو عام لمحات کی بات تو الگ رہی خلوت میں بھی اذیت کے نئے حربے تلاش کرتا رہتا تھا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عزت النساء، کی زندگی کس طور پر گزر رہی ہوگی۔ جلال الدین کا سارا کاروبار ان کا خاندانی منشی بنسی دھر پرشاد سنبھالتے تھے ان کا حال یہ تھا کہ ڈیوڑھی پر جب آتے تو وہ احترام یا خوف سے ڈیوڑھی کے باہر جوتی اتار دیتے اور دھوتی کھول کر لنگی بنا لیتے اور ان کی یہ مجال نہ ہوتی کہ وہ اپنی آمد کی خبر اندر بھجوا سکیں وہ تب تک بیٹھے رہتے جب تک انہیں جانے کی اجازت نہیں مل جاتی، یہ سلسلہ تقریباً آٹھ سال تک چلتا رہا اور اچانک جلال الدین پر فالج کا حملہ ہوتا ہے جس نے صرف اس کو ہی نہیں بلکہ پورے گھر کو فالج زدہ بنا دیا تھا۔جلال الدین کے جسم پر ہی فالج کا اثر نہیں ہوا بلکہ اس کی زبان پر بھی فالج نے اپنا اثر دکھایا خاندانی منشی لالہ بنسی دھر پرشاد جو اپنی چاپلوسی کی بدولت تمام زمین وجائیداد کے مختار عام تھے وقت بدلتے ہی وہ سب کچھ سمیٹ کر منظر نامہ سے غائب ہو گئے تو عزت النساء کی زندگی خارش زدہ کتے کے سر کا زخم بن گئی تھی۔مگر اب تو ان کے لئے اپنے وجود کو قائم رکھنے کا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ان کی خانہ داری کی ضرورت ہو یا، کاروبار کا حساب زمین جائیداد کے اندراج ہوں یا باغ باغیچے کی فکر ان سب نے انہیں پوری طرح جکڑ لیا اور انہیں مجبوراً منشی بنسی دھر پرشاد کے گھر کا رخ کرنا پڑا۔اس منظر کو حسین الحق نے کچھ یوں بیان کیا ہے:۔

> ''جب لالہ کو گئے مہینے پر مہینے گزرنے لگے اور گھر کا سامان بکنے کی باری آ گئی تو پہلی مرتبہ عزت النساء نے ڈیوڑھی سے باہر قدم رکھا...... لالہ کے گھر عزت النساء پہنچیں تو گویا ایک خاموش سی ہلچل مچ گئی...... لالہ کی بوڑھی ماں تیز قدموں سے چلتی ہوئی خود باہر آ گئیں۔''مالکن آپ؟''''جی ہاں سوچا کہ ذرا آپ کا گھر بھی دیکھ لوں'' عزت النساء نے ہلکے سے مسکرا کر جواب دیا اور گھر پر ایک نگاہ ڈالی۔ان کی اپنی حویلی سے بھی بڑی تھی ان کے منشی کی حویلی......''لالہ بنسی دھر کہاں ہیں؟'' کچھ ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد عزت النساء نفس مطلب پر آ ہی گئیں۔''ان کا حال احوال ہم سے نہ پوچھئے۔اپنی کوکھ کا پیدا ایسا پرایا ہو جائے گا، ہم نے نہیں سوچا تھا۔
> تین ماہ پہلے اپنے بیوی بچوں کو لے کر دہلی چلے گئے۔اگر ہریہر نہ ہوتا تو ہمیں تو کوئی پوچھنے والا بھی نہ ہوتا''۔[۱]
> عزت النساء نے صاف محسوس کر لیا کہ ماتا جی بنسی دھر کے حوالے سے کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتیں......
> ''اچھا ماتا جی، میں چلتی ہوں''۔[۲]

عزت النساء اب زیادہ دیر وہاں رکنا نہیں چاہتی تھی وہ واپس اپنی حویلی لوٹ آئی۔گھر پہنچیں تو باورچی خانے سے فارغ ہوتے ہوتے رات سر پر آن کھڑی ہوئی سب کو کھلا پلا کر وہ بستر پر گئی تو دماغ اڑ رہا تھا۔ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے شوہر کا علاج تو دور کی بات کھانے کپڑے کا بندوبست مشکل ہو گیا تھا۔کوئی بھی مصیبت کی گھڑی میں کام آنے والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ عزت النساء ایسے حالات سے بہت پریشان ہو گئی تھی کہ ایک دن لالہ ہریہر پرشاد ان کے گھر آئے جو اپنے بڑے بھائی لالہ بنسی دھر کے بالکل برعکس نظر آتا ہے۔وہ نیک ملنسار اور وفادار ہے۔جس کا نقشہ مصنف نے کچھ اس طرح پیش کیا ہے۔

> ''پوس کا مہینہ جا رہا تھا۔چاند کی آخری تاریخوں کی رات تھی۔اندھیرا امڈ گھمڈ کر عزت النساء کے گھر پر برس رہا تھا۔عزت النساء سمجھ نہیں پائیں۔ اس ٹھنڈی اور اندھیری رات میں کون ہو سکتا ہے۔مگر دروازے پر کسی کے ہونے کا گمان کم اور یقین زیادہ ہوا...... دروازے پر لالہ ہریہر پرشاد کھڑے تھے۔''لالہ جی آپ؟'' لالہ ہریہر پرشاد دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑے رہے۔ کچھ دیر تو وہ لالہ کو صرف دیکھتی رہی۔دراصل وہ سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ وہ کیا کریں......مگر چند ہی لمحوں میں وہ سنبھل گئی۔[۳]

اب ہر دوسرے تیسرے دن لالہ ہریہر پرشاد عزت النساء کے گھر آنے جانے لگے۔لالہ کی آمد تحفوں کے ساتھ جاری رہی اور برسوں سے شوہر کی مستقل بیماری اور افلاس کے لاعلاج روگ کے سبب زندگی کی سخت دھوپ میں چلتی ہوئی بی بی عزت النساء کو ہریہر پرشاد ایک شجر سایہ دار کی صورت میں ملتے ہیں اور وہ عجیب وغریب احساسات سے دوچار ہوتی ہیں۔ایسے قیامت خیز لمحے میں عزت النساء کو پھر وہ لڑکا یاد آتا ہے جو ہر وقت اس کی یادوں میں رہتا ہے جس سے شادی کے بعد بس ایک مرتبہ ملاقات ہوئی تھی اور اس کی آواز سمندر کی آخری سطحوں تک سنائی دیتی رہی''بی بی آپ کیسی ہیں؟ آپ کو دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئیں'' اب اس لڑکے کی جگہ لالہ ہریہر پرشاد لے چکے تھے۔ان کیفیات کا بیان افسانہ نگار نے کچھ اس طرح سے کیا ہے۔

> ''اس رات عزت النساء پر رنگوں نے یلغار کی۔نیلا، پیلا، لال، کاسنی، گلابی، فیروزی، چمپئی، کتھی، لاجودی، کاہی، پتی، سرمئی...... رنگوں کی بھرمار تھی اور موسم سرد دھند میں ڈوبا ہوا، پھر پرندوں نے ان کے گرد گھیرا ڈالا...... پہلی مرتبہ باتوں کا رخ عزت النساء کے میکے کی طرف مڑا اور یوں مڑا کہ خود انہیں اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ حال کے جلتے سلگتے ریگستان سے ماضی کی نرم اور ٹھنڈی چھاؤں میں کیسے پہنچ گئیں''۔[۴]

عزت النساء کے لئے سب راہیں بند تھیں، وہ بے حد دکھی، بے بس اور بے سہارا عورت تھی۔ لالہ ہری ہر پرشاد ایک فرشتہ صفت آدمی ہے لیکن وہ فرشتہ نہیں آدمی ہے۔اس کا سہارا عزت النساء کے لئے گناہ کا دروازہ کھولتا ہے کیونکہ بعد کے دنوں میں لالہ ہری ہر پرشاد جب ان کے گھر آنے لگے اور شروع میں تو لالہ ہری ہر پرشاد نے تحفے تحائف تک خود کو محدود رکھا پر ایک منزل وہ بھی آئی کہ وہ ہر ماہ پانچ سو روپیہ عزت النساء کو دینے لگے اور بالآخر اس کا بدل بھی مانگ بیٹھے۔لالہ

کی خواہش بھی عجیب ۔رات کے اندھیرے میں آتا اور دن کے اجالے میں عزت النساء کے مکمل وجود کو جی بھر کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کرتا۔پھر ایک دن ایسا ہوا کہ لالہ بہت جلد بازی میں آئے اور بغیر کچھ بولے ایک خط عزت النساء کے حوالے کر کے گھر سے باہر نکل گئے ۔عزت النساء نے کمرے میں آ کر لالٹین کی روشنی تیز کی اور خط پڑھنے لگی ۔اس خط میں لالہ ہری ہر پرشاد نے لکھا تھا۔میں خود کو مجرم محسوس کرنے لگا ہوں......آپ کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھانے کا مجھے کوئی حق نہیں...... مجھے آپ کی خدمت کرنی ہے،میں تاحیات کئے جاؤں اس خدمت کا اجر صرف آپ کی خوشی ہے...... مجھے بس تھوڑی سی سانس......تھوڑی سی ہوا کی ضرورت ہے......لالہ ہر یہر پرشاد۔

(''پیلی کوٹھی'' بائی پاس روڈ پر پہلے بائیں موڑ کی دوسری گلی کا آخری مکان،موجود رہنے کا وقت......گیارہ بجے دن سے دوپہر دو بجے تک......بدھ اور اتوار)

دوسرے دن اتوار تھا۔بی بی عزت النساء تین بجے سہ پہر کے قریب گھر میں داخل ہوئیں۔وہ لالہ کی لائی ہوئی ساری پہنے ہوئے تھی گھر میں داخل ہوئیں تو دیکھا ،محلے کی ایک عورت ان کا انتظار کر رہی تھی۔اسی دن،مغرب بعد،اس کے یہاں محفل میلاد شریف تھی۔میلاد میں جانے کے لئے بی بی عزت النساء نے جلال الدین کی خریدی ایک پرانی ساری نکالی،زیب تن کیا۔اور وقت سے ذرا پہلے محفل میں حاضر ہوگئیں۔اس کہانی میں دراصل حسین الحق نے ایک عبرت ناک مثال پیش کی ہے۔زمینداروں کی ایک ایسی مثال جو صرف اپنے بیوی بچوں پر صبر نہیں کرتے بلکہ انہیں کوئی فکر نہیں ہوتی صرف منشی بنسی دھر جیسے ریاکار اور وفادار مختار کے سہارے ان کا کاروبار چلتا ہے۔جلال الدین کو اس بات کی بھی جانکاری نہیں کہ اس کی کتنی جائیداد کہاں ہے منشی بنسی دھر جب سب سمیٹ کر نکل جاتا ہے اور صرف رہ جاتی ہے عزت النساء جس کے پاس صرف عزت کی دولت ہی رہ جاتی ہے جسے منشی کا چھوٹا بھائی لوٹنے کی ترکیب بناتا ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔اگر عزت النساء کے ساتھ جلال الدین کی وفاداری محبت اور ایثار کی کوئی بھی مثال ہوتی تو شاید وہ اس کے سہارے زندگی جینے کی کوشش کرتی لیکن جلال الدین کی بدسلوکی اور بدمزاجی کی وجہ سے عزت النساء کی یادوں میں صرف وہ باؤلا لڑکا تھا جس کی جگہ لالہ ہری پرشاد لے لیتے ہیں اور مجبوراً بے بس عزت النساء حالات سے تنگ آ کر اس موڑ تک آجاتی ہے جہاں وہ آنا نہیں چاہتی تھی افسانہ'ناگہانی'' کا اختتام ملاحظہ فرمائیں:

> وہ لالہ کی ساڑھی پہنے ہوئے تھیں......میلاد شریف میں جانے کے لئے بی بی عزت النساء نے جلال الدین کی خریدی ایک پرانی ساڑھی نکالی، زیب تن کیا،وقت سے ذرا پہلے ہی محفل میں حاضر ہوگئیں اور میلاد انہوں نے ایسے الحاح وزاری سے پڑھا کہ سننے والوں کی آنکھیں نم ہوگئیں۔خود عزت النساء کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔بی بی عزت النساء روئے جارہی تھی اور پڑھے جارہی تھیں: خدا کے قہر سے روز جزا،بچا لینا،بہت ہوں عاجز ولاچار یارسول اللہؐ

فہرست

۱)شعر و حکمت:ص ۱۸۵۔۱۵۹،کتاب دورسوم
۲)نیوکی اینٹ از حسین الحق:ص ۱۳۔۱۲۔۱۱
۳)ایضاً:ص ۱۴
۴)ایضاً:ص ۱۸
۵)ایضاً:ص ۲۴
۶)ایضاً:ص ۲۴

□□□

غزل

سمجھ رہے ہو کہ اب عمر کی ڈھلان میں ہوں
تمہیں خبر بھی ہے میں عقل کی اُڑان میں ہوں

یہ چاہتا ہوں کہ آپس میں اتحاد رہے
نقیب امن و اماں کے میں خاندان میں ہوں

جو مجھ پہ تھوکو گے تُم وہ پلٹ کے آئے گا
نشیب زادو! میں عظمت کے آسمان میں ہوں

نہ ہوگا مجھ پہ اثر مشکلوں کی دھوپوں کا
میں اپنی ماں کی دُعاؤں کے سائبان میں ہوں

وہ کاش آکے تصور میں مجھ کو مہکائے
نہ جانے کب سے میں بیٹھا اُسی کے دھیان میں ہوں

یقیں ہے مجھ کو کہ یہ مرحلہ بھی طے ہوگا
پُراعتماد ہوں ، گو سخت اِمتحان میں ہوں

پلٹ کے آنے کا وعدہ وفا کرے گا وہ
نہ جانے کب سے ہی ساجدؔ اسی گمان میں ہوں

ساجد خیرآبادی
بستی رام کٹرہ،نزد نیلا انجن پبلک اسکول کاکوری،لکھنؤ
9369095249

غزل

دل و جگر کے لہو سے غزل لکھی جائے
قلم دوات کی بندش ہی توڑ دی جائے

غزل میں لفظ کا جس طرح وزن کرتے ہیں
زباں پہ آئی ہوئی بات تول لی جائے

عذاب آیا تو اب کس نبی کو ڈھونڈوگے
یہ بات اہل قبیلہ سے پوچھ لی جائے

سوال یہ ہے مرا قتل کیوں نہیں رکتا
سوال یہ نہیں قاتل کو پھانسی دی جائے

یہی ہے راز شب غم کی صبح کرنے کا
تمام رات محبت کی بات کی جائے

متاع عہد گذشتہ لگا رہا ہے صدا
حویلیوں میں دفینوں کی کھوج کی جائے

قبول آپ کا ہر فیصلہ مگر کوثر
غریبِ شہر کی فریاد تو سُنی جائے

کوثر صدیقی
سابق ایڈیٹر کاروانِ ادب، گنوری میاں روڈ، بھوپال
9926404171

غزل

دھڑکنیں تیز ہُوا کرتی ہیں آنے پہ ترے
نَبض کچھ دیر ٹھہر جاتی ہے جانے پہ ترے

رونقیں، فرحتیں، خوشبوئیں، بہاریں، نغمے
کتنے احسان ہیں اے جان زمانے پہ ترے

دل کشی، حُسن، حیا، ناز، محبّت شوخی
کئی عُنوان چمکتے ہیں فسانے پہ ترے

شاعر و بادہ کش و رند و خراب و مجنوں
کتنے الزام لگا ہیں دِوانے پہ ترے

خط لکھے، شعر کہے، راتوں کو جاگے، گھومے
ہم نے کیا کیا نہ کیا رُوٹھ کے جانے پہ ترے

دوستی، جھوٹ، وفا، دھوکہ، تعلق ہے فریب
اور کیا کیا نہ گماں آیا نہ آنے پہ ترے

دل میں تیری ہی طرح بیٹھی ہوئی ہے وہ بات
یوں تو ہم مان گئے باتیں بنانے پہ ترے

جنید اکرم فاروقی
امروہہ
9259604319

شمس الہدیٰ انصاری (علیگ)

چھوٹے حاجی صاحب، نشاط نگر، واسع پور، دھنباد

8271638323

پرُ اسرار کائنات

اس جھیل میں کتنا پانی ہوگا؟ میرا دوست ایک گھنے سایے دار درخت کے نیچے نیم دراز تھا۔ یہ توپ چانچی جھیل کی ایک خوبصورت شام تھی۔ میرا دوست اُٹھ کر میرے ساتھ جھیل کے کنارے چہل قدمی کرنے لگا، پھر کچھ کمفرت محسوس کرنے کے لئے کسی بینچ پر بیٹھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ہم لوگ جگہ کی تلاش میں جھیل کے کنارے کافی آگے نکل آئے۔ آخر کار ایک بینچ پر ایک لڑکی بیٹھی ہوئی ملی۔ اس بینچ پر دو نشستیں خالی تھیں۔ لہذا ہم لوگ اس بینچ پر بیٹھ گئے۔ لڑکی دنیا و مافیہا سے بیگانہ خلاء میں گھور رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی اور لاتعلقی کی ملی جلی کیفیات تھیں۔ ہم ایک سنہری شام تھی۔ سورج کا سونا جھیل کے پانیوں میں طلسماتی راستہ بنا چکا تھا۔ آبی پرندے جھیل کی سطح پر لہرا رہے تھے اور بھی لمبی لمبی گھاس ہوا کے دوش پر سرسرا رہی تھی۔ نیز موٹر بوٹس پانی کی خاموشی سطح پر لہریں پیدا کر رہی تھیں۔

اس جھیل کی خوبصورت شاموں میں سی ایک شام تھی۔ لیکن وہ لڑکی فطرت کی ان منظروں اور خوبصورتیوں پر توجہ دینے کے بجائے آسمان کے خلاؤں میں جھانک رہی تھی! میں اس لڑکی کو کن انکھیوں سے دیکھنے لگا، مجھے لگا وہ دنیا کی ٹھکرائی یا گہری چوٹ کھائی لڑکی لگ رہی تھی۔ آخر میں ہی لڑکی سے مخاطب ہوا اور سوالیہ انداز میں کہا کہ اس جھیل کا قطر کیا ہے، اس کی گہرائی کیا ہوگی۔ شعوری طرح پر لڑکی فوراً بول پڑی اور اپنا تعارف پیش کرنے لگی۔ میں پاس کے گاؤں ٹھا کر چک کی رہنے والی ہوں اور توپ چانچی کالج کی میں طالبہ ہوں۔ آپ نے پوچھ ہی لیا ہے تو میں عرض کر دوں کہ اس جھیل کی قطر ۳ کلو میٹر اور گہرائی ۳۰ میٹر ہے۔ سورج اب اپنی الوداعی کرنوں کے ساتھ پہاڑ کی اوٹ میں چھپنے لگا تھا۔ اندھیرا اب غالب ہونے لگا تھا۔ لڑکی بھی اب واپس جانے کی تیاری کرنے لگی اور اپنے بیگ کو پشت پر ڈال لیا۔

میں نے جنگل کی طرف دیکھا، جنگل میں جھینگر مکوڑے کوڑے بول رہے تھے۔ جھینگروں کی آوازیں رات کی دستک۔ دینے لگی ہیں، مجھے زندگی میں پہلی بار معلوم ہوا جب ایک جھینگر کیڑا بولتا ہے تو اس کی آواز ٹوٹنے سے پہلے دوسرا جھینگر اس کی سر میں طال کر ملانے لگتا ہے اور یوں جھینگروں کی آوازوں کا ایک نہ ختم ہونے والا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مجھے پہلی بار معلومات میں اضافہ ہوا، جھینگر آواز توڑے بغیر آدھے گھنٹے تک مسلسل بول سکتے ہیں۔ میں جھینگروں کی مسحور کن آہنگ میں گم ہو گیا لیکن میرا دوست اور یہ لڑکی اس جھیل کے موجودہ پانی کی مقدار پر لڑ رہے تھے۔ اس کے بعد دنیا جہان کی جھیلوں پر بحث کرنے لگے۔ لڑکی کا کہنا تھا کہ سری نگر کی ڈل جھیل کو دنیا کی سب سے خوبصورت جھیل ہے جبکہ میرا دوست سوئٹزرلینڈ کی تھن لیک" کو نمبر ون قرار دے رہا تھا۔

میری چھنگر کے دوران دونوں نیا گرا فال" تک پہنچ گئے اور انہوں نے اس آبشار سے گرنے والے پانی کا تخمینہ لگانا شروع کر دیا۔ وہاں سے یہ لوگ دریائے نیل کا سفر کرنے لگے اور یہ ثابت کرنے لگے کہ ہمارے دریائے سندھ کا پانی دریائے نیل سے کہیں زیادہ زرخیز اور اُپجاؤ ہے۔ دریائے سندھ سے یہ لوگ گلیشیرز کی پہاڑویوں کو عبور کرنے لگے۔ گلیشیرز پگھلنے کا اصل وجہ گلوبل وارمنگ کا درپیش مسئلہ ہے۔ لڑکی کہنے لگی اگلے پندرہ برسوں میں پانی کی سطح سمندر میں ایک فٹ کا اضافہ ہو جائے گا اور اس اضافے سے دنیا کے ۲۱ مما لک میں سیلابوں اور آئی آفتوں کا آغاز ہو جائے گا۔ پھر بحث اسلام آباد کی پہاڑیوں میں بے شمار چشمے اور آبشار سوکھ چکے ہیں۔ یہ دونوں بری طرح گفتگو اور بحث میں الجھ چکے تھے۔ جبکہ میں جھینگروں کی آوازیں گننے میں مصروف تھا۔ میں نے اس تحقیق اور عرق ریزی کے دوران یہ جانا کہ مادہ جھینگر کی آواز میں نر اور مادّہ آہنگ زیر و بم زیادہ ہوتا ہے جبکہ نر جھینگر میں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں بڑی دیر تک تحقیق کرتا رہا۔ میرا دماغ پر مضمحل ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے دوست کو واپس چلنے کا اشارہ کیا، اس نے اپنی جیب سے کارڈ نکالا اور لڑکی کو دیکر کہا، یہ میرا کارڈ۔ آپ مجھے فون کیجئے گا میں آپ کو تھمن ایک" اور" کے ٹو کے گلیشیرز کی تصویریں دکھاؤں گا لڑکی سرگوشیوں میں تھینکس کہتی ہوئی چل پڑی۔

> ”کائنات کتنی بے نیاز کٹھور، خاموش اور پرُ اسرار ہے۔ اپنا کوئی راز دنیا والوں پر عیاں نہیں کرتی۔ سائنس داں ہمہ وقت سرگرداں ہیں۔ اربوں روپے بے دریغ خرچ کر رہا ہے۔ اس کی اندھی طاقتوں کے خلاف انسان کی لڑائی کتنی غیر مساوی ہے۔ زندگی کی بازی تو انسان جنم لیتے ہی ہار جاتا ہے۔ کیونکہ پیدا ہوتے ہی اس کا سفر عدم کی جانب رواں رہتی ہے۔ اس کے ارد گرد قدرتی مناظر ہر ہر قدم پر بکھری ہوئی تھیں؟ سرسبز شاداب جنگل میں بے ترتیب مختلف اشجار کے سلسلے پرسکون جھیل کے کنارے اونچی نیچی زمینیں، جھاڑ جھنکار نیز جنگلی پھولوں اور اس کا محور کن خوشبو فطرت کے آزادانہ احساس کی نمائندگی کر رہا تھا۔ یہ احساسات انسانی شعور کی گرفت سے آزاد تھی مگر یہ لمحہ سراپا پرُ آہنگ تھا۔ اب نومبر کی آمد تھی۔“

دوسری شام وہ لڑکی کالج سے سیدھی جھیل کے کنارے بنے پتھر کی کرسی پر بیٹھ گئی۔اس طرح بیٹھی کہ منہ پر سورج کی کرنیں نہ پڑیں اور جسم کا باقی حصہ نرم تپش کے حوالے ہو جائے، پھر ہاتھ میں کتاب کو الٹ پلٹ کرنے لگی۔ وہ مسکرا پڑی۔مسکرانے کے رنگ کے ساتھ فہم و بصیرت کے دروازے بھی پوری طرح وا ہوگئیں وہ کون کمبخت ہوگا جو قدرت اور اس کے بنائے شاہ کار سورج چاند اور اس قلم کار کی قسمت پر رشک نہ کرے جو گیتا نجلی جیسی شاہکار نظمیں دے گیا۔

ایسی ہی تو پ جاپنی جھیل کی حسین شام تھی۔اسی انداز میں وہ لڑکی بیٹھی ہوئی تھی اور رشک کر رہی تھی۔آسمان میں چمکتے سورج کی نرم شعاؤں کی حرارت کی تاثر اور دانشوروں کی بھاری بھرکم نیز تخلیق کار کی دلچسپ کتابوں کی باتوں سے وہ مجھے مستفض کر رہی تھیں!

کائنات کتنی بے نیاز کٹھور، خاموش اور پرُ اسرار ہے۔اپنا کوئی راز دنیا والوں پر عیاں نہیں کرتی۔سائنس داں ہمہ وقت سرگرداں ہیں۔اربوں روپے بے دریغ خرچ کر رہا ہے۔اس کی اندھی طاقتوں کے خلاف انسان کی لڑائی کتنی غیر مساوی ہے۔زندگی کی بازی تو انسان جنم لیتے ہی ہار جاتا ہے۔کیونکہ پیدا ہوتے ہی اس کا سفر عدم کی جانب رواں رہتی ہے۔اس کے ارد گرد قدرتی مناظر ہر ہر قدم پر بکھری ہوئی تھیں؟ سرسبز شاداب جنگل میں بے ترتیب مختلف اشجار کے سلسلے پر سکون جھیل کے کنارے اونچی نیچی زمینیں، جھاڑ جھنکار نیز جنگی پھولوں اور اس کا محور کن خوشبو فطرت کے آزادانہ احساس کی نمائندگی کر رہا تھا۔یہ احساسات انسانی شعور کی گرفت سے آزاد تھی مگر یہ لمحہ سرپا پرُ آہنگ تھا۔اب نومبر کی آمد تھی۔موسموں کے تغیرات کی ہوائیں، خزاں آلودہ پتوں اور سوکھی ٹہنیوں کے جسموں کو چھوڑ کر طرح طرح کے رنگ و آہنگ اُبھارتیں ہیں۔انواع اقسام کے معصوم پرندوں کا گیت اور چوپائیوں کے مسرت آفرین لمحات سے آوازیں ابھر رہی تھیں۔ پہاڑوں کے چھوٹے چھوٹے آبشار، انتہائی چھوٹی ندیاں جھیل کی گود کو بھرتی رہتی ہیں۔آبشار اتنی کہ پر و آہنگ تھی کہ کسی مخصوص لمحے میں بھی رکنے کا نام نہیں لیتیں۔آبشار و ندیوں کی مخلوط موسیقی کا اور پرندوں کے میٹھے میٹھے کہ شور میں پرا نہیں مدغم ہو رہی تھیں۔ پاس ہی کھڑا اگڑ ریا اپنی بانسری کے شور سے مویشیوں کو یکجا کر رہا تھا۔ جھیل کے اس پار دیہاتی بازار جہاں معصوم خرید فروخت کرنے والے چولی اور لہنگے جیسے لباس کا امتزاج انواع اقسام کی دیہاتی اشیاء کی فراوانی نیز معصوم دیہاتی مول بھاؤ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں!

شام کو کچے مکانوں سے دھویں کی اٹھتی پتلی ہی لکیر، وہ اُپلے اور لکڑیوں کا انبار، ایک عجیب سماں پیدا کر رہا تھا۔رات نے اندھیرا پسار لیا تھا۔کئی ساعتوں کے بعد اب صبح کا وقت تھا۔پو پھٹ رہی تھی۔تھوڑی ہی دیر میں نرم سورج اپنی شعائیں بکھیرنے کے لئے تیار تھی نسیم صبح کی ہلکی ہلکی آتی ہوئی ہوا۔زبردست تازگی و فرحت کا احساس دلا رہی تھی۔

نومبر کا وسط مہینہ محو پرواز تھا۔بادِ صبا کی خنکی موسم کو اور بھی دلنشیں اور خوشگوار بنا رہا تھا۔ایک نوجوان لڑکا اپنے مویشیوں کو ہانکتا ہوا بانسری پر صبح کی تازگی پر ایک دھن بجا رہا تھا۔جانوروں کا ریوڑ ناہموار زمین پر رواں دواں تھا۔صبح دم بانسری کی مدبھر دھن پر دہقانی گڑریا جمع ہونے لگے۔چرواہے وجد کے عالم میں جھوم رہے تھے اور موسیقی کی وادیوں میں ہوا کی دوش پر ایک سحر سا پیدا کر رہا تھا۔ بانسری بجاتا ہوا دہکانی گڈریا آنکھیں بند کئے موسم کی تغیر کے باوجود پسینے میں شرابور تھا۔

خوشبو کی بانہوں میں، شجر، لرزنے پھول پتیاں، تتلیاں بھی پھُر پھُر اڑ رہی تھیں پرندوں کا ڈار بھی اپنے لئے روزی کی تلاش میں محو پرواز تھا۔ پرواز کرتے کرتے بیکراں آسمان کی وسعتوں میں کھو گیا۔

❑❑❑

غزل

چار سُو دیکھنا ، حیران و پریشاں ہونا
وہ مری جنبش لب ، اُس کا پشیماں ہونا

کوئی پیغام نہیں ہے تو ذرا دیر ٹھہر!
کس سے سیکھا ہے صبا تو نے گریزاں ہونا

دل دھڑکتا ہے بہت زور سے ہر آہٹ پر
جان لے لے گا ترے ہونے کا امکاں ہونا

اے صبا! تو نے تو دیکھا ہے وہ منظر، وہ سماں
اُس کا جانا ، مری آنکھوں کا بیاباں ہونا

اُس کی آمد کا پتہ دیتی ہے پھولوں کی مہک
ہم نے دیکھا ہے بہاروں کا گُل اَفشاں ہونا

تیری ہر شرط پہ منظور کہا ، چُپ نہ رہے
ورنہ آسان کہاں تھا ترا آساں ہونا

قابل رَشک ہے وہ ، جو ترا مہمان رہے
سب کی قسمت میں کہاں ہے ترا مہماں ہونا

خیریت پُوچھنے پروائی مزاج آئیں گے
سہل جانو ہو میاں درد کا درماں ہونا

ہم نے خود لاج رکھی اہل جُنوں کی جاوید
ہم پہ دُشوار نہ تھا چاک گریباں ہونا

جاوید اکرم
یاسمین منزل مغل گارڈن، متقی پور لکھنؤ
8127855655

ڈاکٹر تمنا نسیم

۵/ایم ایم دتتا روڈ، بج بج، ۲۴/پرگنہ

8820414403

غریب کی عید

یہ کہانی ہے دہلی میں رہنے والی رضیہ خاتون کی۔ رضیہ اپنی بیٹی سلمیٰ اور اپنے شوہر حامد کے ساتھ دہلی میں رہا کرتی تھی- اس کا شوہر پیشے سے مچھوارا تھا، وہ روزانہ ندی میں مچھلی پکڑنے جایا کرتا تھا- ندی سے مچھلی پکڑ کر بازاروں میں بیچا کرتا یہی اس کا ذریعہ معاش تھا- سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی چل رہا تھا۔ غریبی میں بھی یہ لوگ خوشحال تھے۔ روزانہ کی طرح اس دن بھی حامد ندی میں مچھلی پکڑنے گیا لیکن خراب موسم ہونے کی وجہ سے ندی میں ڈوب گیا ہے۔ کسی نے اس کی خبر رضیہ کو دی کہ تمہارا شوہر ندی میں ڈوب گیا اور کافی تلاش کرنے کے بعد بھی اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا- اس خبر کو سننے کے بعد رضیہ کا دل و دماغ اس بات کو ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ اس کا شوہر اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اس حادثے کے بعد سے وہ اکثر ندی کے کنارے بیٹھ کر اپنے شوہر کا انتظار کیا کرتی تھی- اسے یقین تھا کہ اس کا شوہر کہیں نہ کہیں سے ضرور آئے گا۔ اس طرح کئی دن بیت گئے اور گھر میں بچا ہوا اناج بھی آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا- ایک جوان بیوہ عورت کو سماج میں زندگی گزارنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے، سماج کے کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو بہتی ہوئی ندی میں ہاتھ دھونے کی کوشش کرتے ہیں- اس مصیبت کی گھڑی میں رضیہ کو اپنا میکہ یاد آیا۔ رضیہ اپنی بیٹی سلمیٰ کو لے کر میکے چلی گئی کچھ دن گزرے تھے کہ بھابھی نے طعنے مارنے شروع کر دیے، کتنے دنوں تک بیٹھی بیٹھی روٹی توڑو، گی ہمیں بھی محنت کرنی پڑتی ہے تب جا کر دو وقت کی روٹی ملتی ہے۔ ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، خرچ ہے، بس اب تمہارا بوجھ ہم سے نہیں اٹھایا جاتا ہے کہیں اور چلی جاؤ۔ یہ سننا تھا کہ رضیہ اپنی بیٹی کو لے کر گھر واپس آ جاتی ہے- گھر کے قریب ہی ایک زمیندار کے یہاں بطور نوکرانی کا کام کرنے لگتی ہے۔ ایک روز رضیہ جب کام کر کے گھر واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ اس کی بیٹی سلمیٰ مایوس بیٹھی ہوئی ہے اور اس کا چہرہ اترا ہوا ہے- ماں نے بیٹی سے مایوسی کی وجہ پوچھی- تو اس نے بتایا کہ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی کہ، اس کی سہیلیوں نے بتایا کہ ان کے ابو نئی چوڑیاں نئے کپڑے اور نئے نئے کھلونے خرید کر لائے ہیں لیکن امی میرے ابو نہ ہی کبھی آتے ہیں اور نہ کھلونے خرید کر لاتے ہیں ابو کیوں نہیں آتے وہ کہاں گئے ہیں؟

رضیہ:- تمہارے ابو اللہ کے پاس گئے ہیں کچھ دنوں کے بعد وہاں سے آئیں گے۔ سلمیٰ- امی میرے دوست کہہ رہے تھے جو لوگ اللہ کے پاس جاتے ہیں وہ دوبارہ واپس نہیں آتے ہیں۔ رضیہ- جھنجھلا کر میں نے کہا نہ وہ اللہ کے پاس گئے بس میں تمہارے سارے سوالوں کا جواب نہیں دے سکتی۔ سلمی، ماں کے اس جواب سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رضیہ بیٹی کو روتا دیکھ گود میں لے کر پیار کرنے لگی۔ میری پیاری بیٹی دیکھو رمضان آنے والا ہے میں بھی تمہارے لیے عید میں نئے کپڑے نئے چوڑی اور نئے نئے کھلونے خریدوں گی-

سلمیٰ ماں کے گلے سے لپٹ گئی، میری پیاری امی میری امی جان اس بار ہم عید بہت ہی اچھے سے منائیں گے- لیکن کون جانتا تھا سلمیٰ کو یہ خوشیاں نصیب ہوں گی یا نہیں۔ زندگی چلتی ہے اپنے طریقے سے، ہم سوچتے کچھ اور ہیں لیکن ہوتا کچھ اور ہے۔ رضیہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ رمضان تو شروع ہو گیا لیکن وہ رمضان میں سخت بیمار پڑ گئی- یہاں تک کہ اتنی کمزور ہو گئی تھی بیماری کی وجہ سے کہ وہ کام پر بھی نہ جا پائی- چاروں طرف لوگ عید کی تیاریاں کر رہے تھے، بازاروں میں خریداری کے لیے مصروف تھے- رضیہ کے گھر میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ایک بے سہارا ماں اپنی بیٹی کو لے کر گھر میں پڑی ہوئی تھی- رضیہ کا عید کے بارے میں سوچ کر دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی سے وعدہ جو کر رکھا تھا اب وہ کہاں سے کپڑے جوتے اور کھلونے لائے گی۔ اب عید کے لیے دو روز ہی بچے ہیں، گھر میں نہ پیسہ ہے اور نہ ہی اناج۔ رضیہ کسی طرح اپنی مالکن کے گھر جاتی ہے۔

"امی مجھے وہ چڑیا چاہئے 'وہ چڑیا وہ کیا کرو گی' ہمارے پاس کم پیسے ہیں اس پیسے سے ہی تمہارے لیے کپڑے خریدنا ہے- سلمیٰ ضد پڑ آجاتی ہے۔ امی مجھے وہ چڑیا ہی خریدنا ہے- رضیہ بیٹی کی ضد کے آگے مجبور ہو جاتی ہے- ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا ٹھیک ہے چلو- رضیہ- بھائی صاحب یہ چڑیا کتنے کی ہے؟ دکاندار- میڈم 100 روپے کی۔ رضیہ- حیرت سے 100 روپے کی۔ اس میں کیا خاصیت ہے؟ دکاندار- میڈم یہ چڑیا باتیں بھی کرتی ہے؟ سلمیٰ رات کو چڑیا کو اپنے سرہانے رکھ کر سو گئی۔ آدھی رات کو رضیہ کو کسی کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دی- چڑیا رانی بتا تو تو سب کچھ جانتی ہے سب کچھ بتاتی ہے میرے ابو کہاں گئے ہیں اور کب آئیں گے بتا' ۔ رضیہ- سلمیٰ تم کس سے بات کر رہی ہو اور کیا کر رہی ہو۔"

مالکن! بیمار ہونے کی وجہ سے کام پر نہ آپائی اب دو دن بعد عید ہے، پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔

مالکن نے غصے میں کہا پیسے کیا پیڑ پر اگتے ہیں۔ کام نہیں پیسے نہیں- معاف کرنا رضیہ عید کے موقع پر ویسے خرچ بڑھ جاتا ہے جو بھی پیسے تھے وہ میں نے خریداری میں خرچ کر دیا۔ اگر تم کام پر آتیں تو کوئی نہ کوئی راستہ میں ضرور نکالتی۔ رضیہ نے کہا ٹھیک ہے مالکن کوئی بات نہیں اللہ بہت بڑا ہے- اس طرح رضیہ خالی ہاتھ گھر واپس آجاتی ہے۔ کچھ سوچنے کے بعد اسے یاد آتا ہے اس کے پاس ایک سونے کی ناک کی لونگ ہے، جسے اس کے شوہر نے اسے بطور تحفہ دیا تھا۔ وہ بازار میں اسے بیچنے کے لیے چلی گئی- اسے بیچ کر جو پیسے ملے تھے اسے لے کر اپنی بیٹی کے ساتھ وہ بازار میں خریداری کے لیے گئی- دیکھو سلمیٰ کتنے سارے کپڑے نئے نئے جوتے چوڑیاں اور کھلونے ہیں۔ پسند کرو کون سا تمہیں پسند ہے، لیکن سلمیٰ کی نگاہ تو دور بیٹھے ایک دکاندار پر ٹکی ہوئی تھی جو کھلونے بیچ رہا تھا۔

امی مجھے وہ چڑیا چاہئے۔ وہ چڑیا وہ کیا کرو گی' ہمارے پاس کم پیسے ہیں اس پیسے سے ہی تمہارے لیے کپڑے خریدنا ہے- سلمیٰ ضد پڑ آجاتی ہے۔ امی مجھے وہ چڑیا ہی خریدنا ہے- رضیہ بیٹی کی ضد کے آگے مجبور ہو جاتی ہے- ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا ٹھیک ہے چلو- رضیہ- بھائی صاحب یہ چڑیا کتنے کی ہے؟ دکاندار- میڈم 100 روپے کی۔ رضیہ- حیرت سے 100 روپے کی۔ اس میں کیا خاصیت ہے؟ دکاندار- میڈم یہ چڑیا باتیں بھی کرتی ہے؟ سلمیٰ رات کو چڑیا کو اپنے سرہانے رکھ کر سو گئی۔ آدھی رات کو رضیہ کو کسی کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دی- چڑیا رانی بتا تو تو سب کچھ جانتی ہے سب کچھ بتاتی ہے میرے ابو کہاں گئے ہیں اور کب آئیں گے بتا۔ رضیہ- سلمیٰ تم کس سے بات کر رہی ہو اور کیا کر رہی ہو- سلمیٰ- امی میں اس چڑیا سے ابو کا پتہ پوچھ رہی ہوں- اس جواب سے رضیہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ خود کو روک نہ پائی۔ اس نے بیٹی کو گلے سے لگا کر کہا میری پیاری بیٹی سو جا رات کافی ہو چکی ہے- اور اسے پیار سے تھپتھپانے لگی اور لوری سنا کر اسے سلانے کی کوشش کرنے لگی- آج چاند رات ہے کل صبح ہی عید ہوگی- یہ سوچ کر رضیہ کا دل زوروں سے دھڑک رہا تھا۔ یا اللہ یہ کیسی غریب کی عید ہے نہ ہی نئے کپڑے خریدنے کے لیے پیسے اور نہ ہی عید میں کھانا بنانے کے لیے اناج۔ اب تو ہی بتا میں اس چھوٹی سی بچی کو لے کر کہاں جاؤں۔

رضیہ نے اس بار طے کر لیا تھا کہ کل صبح عید کے موقعے پر گھر کا دروازہ نہیں کھولنا ہے اور سلمیٰ کو گھر پر ہی رکھنا ہے تاکہ اسے یہ معلوم نہ ہو کہ آج عید ہے، ورنہ تو وہ دوسرے بچوں کو عیدگاہ پر جاتے دیکھ روئے گی۔ سوچ ہی رہی تھی اور رو رہی تھی کہ اچانک دروازے پر کوئی دستک دیتا ہے۔

رضیہ! رضیہ! رضیہ اپنے آنچل سے آنسو پوچھتے ہوئے کون؟ آنکھوں میں آنسو ہونے کی وجہ سے چہرہ دھندلا نظر آرہا تھا۔ اس نے آنکھوں کو پوچھا، دیکھتے ہی چونک گئی کون؟ حامد۔ ہاں یہ کوئی اور نہیں رضیہ کا شوہر حامد تھا۔ حامد- ہاں میں رضیہ- لیکن تمہاری تو ندی میں ڈوبنے سے موت ہوگئی تھی۔ حامد- اس دن خراب موسم ہونے کی وجہ سے ندی میں بہہ گیا تھا اور دوسرے شہر چلا گیا تھا- وہاں ایک ضعیف شخص نے میری دیکھ بھال کی اور میری جان بچائی۔ کچھ دنوں بعد وہ ضعیف شخص اچانک بیمار پڑ گیا۔ ایسی صورت میں میں کیسے اپنے محسن کو چھوڑ کر آسکتا تھا، جس نے میری جان بچائی تھی۔ میں اس کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ وہ ایک زمیندار تھے مرتے وقت انھوں نے اپنی تمام جائیداد میرے نام کر دی۔ اب میں وہاں کا زمیندار ہوں۔ رضیہ نے اپنی بیٹی کو حامد کی گود میں دے کر اللہ کا شکر ادا کیا یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے غریب کی عید کو خوشیوں سے بھر دیا۔ سلمیٰ بولی، امی! میری چڑیا نے بھی یہی کہا تھا کہ تمہارے ابو جلد گھر واپس ائیں گے دیکھو ابو آگئے۔

❑❑❑

غزل

جس گھڑی آکے وہ میرے شانے لگے
ہاتھ میرے چمکتے خزانے لگے

دیکھ کر آرہا ہوں میں چہرے نئے
آپ کے سامنے سب پرانے لگے

منتظر ہوں تری ویڈیو کال کا
اپنی صورت دکھا چین آنے لگے

صاف چیٹنگ پہ اپنی اتر آئے وہ
کھیل میں ان کو ہم جب ہرانے لگے

دوست ایسا نہیں چاہیے مجھ کو جو
کر کے احسان فوراً جتانے لگے

بالیقیں اس کی ہی سوچ میں عیب تھا
کانے کو آنکھ والے بھی کانے لگے

کل ملے تھے مجھے راہ میں وہ نفیسؔ
روک کر مجھ کو غزلیں سنانے لگے

نفیس وارثی
ڈیہ پور، کھیری ٹاؤن، ضلع کھیری، یوپی
7379302972

ندا احمد

امبیکا سرگجا، چھتیس گڑھ

9752232178

اُدھار

جہاں بچپن گزرا ہو وہ گھر کوئی نہیں بھولتا ۔ ہم کہیں سے کہیں پہنچ جائیں لیکن وہ گھر ۔ جہاں بچپن بیتا ہو، وہ یاد سدا پاس رہتی ہے ۔ لیکن صرف گھر ہی نہیں، ہم وہ پہلا اسکول بھی نہیں بھلا پاتے ۔ وہ پرانے چھوٹے ساتھی ۔ پڑھائی سے جی چوری ۔ فرسٹ پوزیشن کے لئے مقابلے بازی ۔ ماسٹروں سے ایک دوسرے کی پٹائی ۔ ایگزام کا غم ۔ چھٹی کی خوشی ۔ اور جانے کتنے غم، ہزار مستی ۔ جس سے ملنے کا من، انہیں جینے کا جی ہر کسی کا چاہتا ہے ۔ عمر اکمل بھی کوئی دم لمحے کی فراغت ملنے پر ان لمحوں کو سوچ کے مسکرا دیتا تھا ۔ اسے سب یاد تھا ۔ وہ کب فیل ہوا ۔ کب زیادہ رویا تھا ۔ شاباشی کے بول ۔ شرارتیں مستیاں سب ۔ ٹرین کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے وہ ان سبھی یادوں کو سوچ رہا تھا ۔ تیز گزرتا ہوا کا جھونکا اسے گدگدا کے پار ہو جاتا ۔ اور وہ بکھرتے بال ماتھے سے ہٹاتے ہوئے مسکرا دیتا ۔ اسے اپنی کیفیت میں مسرور ہوتا دیکھ آخر نوارد نے پوچھ ہی لیا ۔’’تمہاری خوشی دیکھ کے لگتا ہے کئی عرصے بعد گھر لوٹ رہے ہو ۔‘‘ سوال پہ عمر نے کھڑکی سے نظر ہٹا کے اس ادھیڑ عمر کے آدمی کو دیکھا ۔ جسے اس نے گھنٹہ بھر پہلے ہی بیٹھتے وقت بتایا تھا کہ وہ ممبئی سے لکھنؤ جا رہا ہے ۔’’گھر؟‘‘ اس کے قیاس پہ اس نے لمحے بھر کو سوچا ۔ اس کا گھر تو ممبئی میں تھا ۔ لکھنؤ میں تو اب کچھ بھی نہ تھا ۔ البتہ پہلے ضرور تھا ۔’’گھر بچپن میں ہوا کرتا تھا ۔ البتہ وہاں جانے کی خوشی ضرور ہے ۔‘‘ عمر نے تامل سے جواب دیا تھا ۔ مگر اصل جواب جواب میں مخفی تھا ۔ لکھنؤ شہر میں اس کی بہت سی یادیں تھیں بچپن کی ۔ مگر وہ ان یادوں کے لئے نہیں جا رہا تھا ۔ یادیں تو دل میں ہمیشہ سے زندہ رہی تھیں گرچہ وہ کہیں بھی رہے ۔ دراصل وہ ایک ادھورے کام کی تکمیل کے لئے پورے بارہ برس بعد اس شہر میں لوٹ رہا تھا ۔ جب وہ چھٹی جماعت میں تھا اس کے والد محترم اسے چھوڑ گئے ۔ ماں کے ساتھ وہ میٹرک تک وہیں رہا ۔ پھر وہ خالہ کے گھر ممبئی چلے آئے اور اس کے بعد عمر اکمل کی پڑھائی نوکری سب وہیں کی ہو کے رہ گئی ۔ اپنی زندگی میں وہ اس قدر محو مصروف ہو گیا کہ اس کے ذہن سے وہ بات ایک دم سے نکل گئی ۔ اور اب طویل عرصہ گزر جانے کے بعد اسے وہ بات یاد آئی تھی ۔ پھر کیا آفس کا کام سب سے چھٹی لے کے اس نے بچپن کے شہر جانے کی پہلی ٹرین پکڑی ۔ ٹرین کے رکنے پر وہ مزید خیال روک کے گاڑی سے اتر گیا ۔’’مسکرائیے آپ لکھنؤ میں ہیں ۔‘‘ عمر بورڈ پڑھ کے آگے بڑھ گیا ۔ جب تک اس کے دل سے بوجھ نہیں اتر جاتا وہ مسکرا کیسے سکتا تھا ۔ پھول باغ کالونی میں کبھی ان کا اپنا چھوٹا فلیٹ ہوا کرتا تھا ۔ جہاں اب کوئی اور آباد تھا ۔ وہ جانتا تھا ۔ اس لئے وہاں جانے کے بجائے وہ سیدھا اسکول گیا ۔ ہاں وہ اسکول ۔ اسی کے لئے تو وہ اس شہر میں لوٹا تھا ۔ ویسے تو سب بدل گیا تھا ۔ لیکن اسکول وہ اب بھی وہیں تھا ۔ البتہ اس کے رنگ روپ سب بدل گئے تھے ۔ وہ عجلت میں آہنی دروازے سے اندر داخل ہوا تھا ۔ اسے سب کچھ یاد آیا تھا ۔ کھیل کا میدان ۔ کلاس روم کو جاتا موڑ ۔ لیکن اس کی بے چین آنکھیں کچھ اور ہی تلاش رہی تھیں ۔ سبک رفتاری سے چلتے ہوئے بالآخر اسے وہ جگہ دکھائی دی جسے وہ ڈھونڈ رہا تھا ۔ اسکول کا کینٹین ۔ یہیں تو اسے آنا تھا ۔ متجسس میں وہ آگے بڑھا ۔ لیکن یہ کیا؟ اس کے قدم یک بیک تھم گئے ۔ وہ سموسے والا ۔ اور اس کے ساتھ کوئی بھی دکھائی نہیں دیا ۔ اس کی جگہ کوئی دوسرے لوگ کام کرتے دکھائی دیے ۔ مگر عمر اکمل کو تو اس سموسے والے سے ہی ملنا تھا ۔ اگر وہ نہ ملا تو؟ سوچ کر ہی وہ خوفزدہ ہو گیا ۔ نہیں ۔ میں انہیں کھوج نکالوں گا ۔ خود کو سمجھا کے اس نے کینٹین والوں سے باز پرس کی ۔’’کہاں ملیں گے وہ؟‘‘ ’’ہمیں نہیں معلوم ۔‘‘ سب نے صاف انکار کیا تھا ۔ لیکن وہ مایوس نہیں ہوا ۔ فوراً اپنے پرانے ساتھیوں کو فون ملایا ۔ لیکن وہاں سے بھی کوئی رسائی نہیں ملی ۔’’اگر واقعی میں رامو بھیا نہیں ملے تو ۔ ۔ کہاں ہوں گے؟ اور یہ جگہ کیوں چھوڑ دیا انہوں نے؟ ان کے سموسے تو کافی بکتے تھے ۔ ہر بچہ مانتا تھا انہیں ۔‘‘ وہ یہاں آ کے بھول گیا تھا ۔ نہ اب وہ پرانا وقت رہا تھا ۔ نہ لوگ ۔ نہ وہ خود ۔

’’بابا نے کہا تھا ۔ کبھی ادھار مت کرنا ۔ کسی بھی چیز کے لئے ۔‘‘ دو سموسے کے آگے عمر اکمل باپ کی نصیحت کو پشت نہیں کر سکتا تھا ۔ اس کی بات سن کے رامو ہنس پڑا ۔ ’’بچے ایک دن کی ادھاری میں کیا جاتا ہے ۔ کل اسکول آتے ہی دے دینا ۔‘‘ اس نے پھر قائل کرنے کی سعی کی ۔ ’’ادھار تو ادھار ہوتا ہے ۔ چاہے ایک دن کا ہو ۔ یا ایک پیسے کا ۔ اگر آج لے لیا تو ادھار کی خصلت کبھی دل سے نہیں جائے گی ۔‘‘ عمر کے جواب پہ رامو لا جواب ہو گیا تھا ۔ ’’ایسا تمہارے بابا نے تم سے کہا تھا؟‘‘ اس کے سر اثبات میں ہلانے پہ وہ آگے بولا ۔’’لیکن یہ نہیں بتایا مجبوری ادھار کا دروازہ دکھا ہی دیتی ہے ۔‘‘ ان کے درمیان رکھے سموسے سے بھانپ نکلنا بند ہو چکا تھا ۔ اور بے آواز کھانے کی فریاد کر رہا تھا ۔’’کہا تھا اگر مجبوری سے ادھاری کا رشتہ ایک دفعہ جوڑ لیا تو پھر وہ کبھی نہیں چھوڑے گا ۔ اس لئے خود کو مجبور نہیں، مضبوط بنانا ۔‘‘

چودہ سالہ عمر اکمل جب بدل گیا تھا تو باقی چیزیں کیونکر نہ بدلتی۔ چند لمحے وہ وہیں کھڑا اطراف میں نظریں گھماتا رہا۔ اس کا راموبھیا سے ملنا بہت ضروری تھا۔ اگر وہ نہ مل سکا تو اپنے بابا سے نظریں نہیں ملا سکے گا۔ اور وہ بوجھ۔ وہ تو ویسا ہی رہے گا۔ چہرہ سرخ پڑ گیا۔

کہاں جائے؟ کس سے پوچھے؟ اسکول سے نکلتے ہوئے بھی سوال ذہن سے نکل نہ سکا۔ ماتھے پہ نمودار پسینے کے قطرے صاف کرتے ہوئے وہ سڑک پہ نکل آیا۔ اور تبھی اسے اپنی پشت سے کسی کی آواز سنائی دی۔ ''کسے تلاش رہے ہو صاحب؟'' شناسا آواز پہ وہ فوراً پلٹا۔ چپراسی کی آواز بھلا وہ کہاں بھول پایا تھا۔ وہ ٹوکنا۔ روکنا۔ چلانا یکلخت سب یاد آیا تھا۔ ''آپ؟'' چپراسی منگل بوڑھا ہو گیا تھا۔ لیکن عمر سفید بڑھی ہوئی داڑھی والے کو اس کی آواز سے ہی پہچان گیا تھا۔

''میں عمر۔'' کہہ کے وہ خود ہی ہنس دیا۔ ہزاروں آتے جاتے بچوں میں بھلا وہ اسے کیسے یاد ہوگا۔ لیکن لیکن وہ سموسے والا ضرور یاد ہوگا۔ آخر وہ بھی تو کھاتے تھے۔ وہ کھل کے ہنستا چلا گیا۔ امید ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

چپراسی منگل نے عمر اکمل کو پتہ بتا دیا تھا۔ لیکن سموسے والے راموکا نہیں اس کے بیٹے کا۔ جو پاس والی گلی میں اسٹال لگاتا تھا۔ وہ عجلت میں اس کے پاس گیا۔ ''مجھے راموبھیا سے ملنا ہے۔'' ایک ہی سانس میں کہا۔ ''باپو تو گھر پہ ہوتے ہیں۔ آج کل طبیعت ناساز۔۔'' پوری بات سنے بغیر ہی عمر نے گھر کا پتہ مانگا تھا۔ اور پھر دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ تیس سیکنڈ بعد وہ اس آدمی کے مقابل تھا۔ وقت نے راموبھیا کو راموبوڑھا میں تبدیل کر دیا تھا۔ تاہم وہ انہیں پہچان گیا۔ وہ شفقت بھری مسکراہٹ اور جلدی اعتبار کرنے والی آنکھیں۔ سب سے پہلے مسکرا کے مصافحہ کیا اور پھر اپنا تعارف کروایا۔

''میں عمر۔ وہیں جسے آپ نے اسرار کر کے فری میں سموسے کھلائے تھے۔'' وہ جانتا تھا۔ جو بات اور یاد اس کے نزدیک اہم تھی۔ وہ انہیں شاید ہی یاد ہوگی۔ چونکہ وہ پہلا عمر نہیں تھا۔ انہوں نے اس جیسے بہتوں کو فری میں کھلایا تھا۔ سبھی بچے ان کی مہربانی کے قائل تھے۔ ''معذرت بیٹا! مگر میں تمہیں پہچان نہیں سکا۔'' انہوں نے تھوڑا الجاجت سے کہا۔ وہ بستر پہ نیم دراز ہو کے بیٹھ گئے تھے۔ ''کینٹین کے کونے میں سب سے چھپ کر بیٹھا بچہ جسے کسی نے نہیں راموبھیا نے دیکھ لیا تھا۔ خالی پیٹ اسکول آنے اور ٹفن بھول آنے کا ملال اس کے چہرے پہ واضح تھا۔ ساتھ آنکھوں میں وہ حیا۔ وہ جھجک جسے سموسے والے نے پڑھ لیا تھا۔ اور پھر پلک جھپکتے ہی اس نے اس بچے کے سامنے میٹھی چٹنی کے ساتھ آلو چھولے کا سالن اور دو گرما گرم خستہ سموسا پیش کیا تھا۔'' عمر یاد دہانی کے طور پہ سوچتے ہوئے بتانے لگا تھا۔ جب۔ بوڑھے چہرے پہ شناسائی کا تاثر بیدار ہوا۔ ''ہاں یاد آیا۔'' مسکراتے ہوئے چہک کے کہا۔ ''بھلا میں اس بچے کی بات کیسے بھول سکتا ہوں۔

عمر بھی کھل کے مسکرا دیا۔ اور پھر دونوں ہی اس لمحے میں چل دیے۔ جہاں چھوٹا عمر سرخ میز پہ کہنی موڑے بیٹھا تھا۔ اور اس کے سامنے راموبھیا۔ ''کیوں بیٹا۔ تمہیں تو بھوک لگی ہے نا۔'' اس کے انکار پہ انہوں نے پوچھا تھا۔ ''میں نہیں کھا سکتا۔'' وہ تھوڑا ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''میرے پاس اس کے پیسے نہیں ہے۔'' رامو اس کے جواب پہ مسکرایا تھا۔ جس نے بھوک سے انکار نہیں کیا تھا۔ بس صاف گوئی سے نہ کھانے کا جواز بتایا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔ تم کھا سکتے ہو۔ میری طرف سے۔'' پلیٹ واپس سے اس کی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔ تاہم اس نے سموسے کی طرف دیکھنے سے گریز برتا تو وہ آگے سے بولا۔ ''پیسے کل دے دینا۔'' ''نہیں۔ میں ادھار نہیں کر سکتا۔'' اب کہ عمر نے تردد میں سر ہلایا۔ ''آج کی ادھاری میں کیا مسئلہ ہے۔ کل چکتا کر دینا۔'' شانے اچکاتے ہوئے حل بتایا۔

لیکن وہ انکار ہی کرتا رہا۔ ''بابا نے کہا تھا۔ کبھی ادھار مت کرنا۔ کسی بھی چیز کے لئے۔'' دو سموسے کے آگے عمر اکمل باپ کی نصیحت کو پشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی بات سن کے رامو ہنس پڑا۔ ''بچے ایک دن کی ادھاری میں کیا جاتا ہے۔ کل اسکول آتے ہی دے دینا۔'' اس نے پھر قائل کرنے کی سعی کی۔ ''ادھار تو ادھار ہوتا ہے۔ چاہے ایک دن کا ہو۔ یا ایک پیسے کا۔ اگر آج لے لیا تو ادھار کی خصلت کبھی دل سے نہیں جائے گی۔'' عمر کے جواب پہ رامو لاجواب ہو گیا تھا۔ ''ایسا تمہارے بابا نے تم سے کہا تھا؟'' اس کے سر اثبات میں ہلانے پہ وہ آگے بولا۔ ''لیکن یہ نہیں بتایا مجبوری ادھار کا دروازہ دکھا ہی دیتی ہے۔'' ان کے درمیان رکھے سموسے سے بھانپ نکلنا بند ہو چکا تھا۔ اور بے آواز کھانے کی فریاد کر رہا تھا۔ ''کہا تھا اگر مجبوری سے ادھاری کا رشتہ ایک دفعہ جوڑ لیا تو پھر وہ کبھی نہیں چھوڑے گا۔ اس لئے خود کو مجبور نہیں، مضبوط بنانا۔''

رامو اسے چند پل دیکھتا رہا تھا۔ ستائش سے فخر سے جو باپ کی نصیحت پہ بھوک مارنے کو تیار تھا۔

''لیکن پھر آپ نے مجھے منا بجھا کے سموما کھلا ہی دیا تھا۔'' وہ دونوں اس لمحے سے نکل آئے تھے۔ نوجوان عمر بوڑھے رامو سے بول رہا تھا۔ ''یہ کہہ کر۔ کل کی ادھاری نہ سہی اسکول سے چھٹی کے بعد ہی تم گھر سے پیسے لا کے مجھے دے دینا۔''

''تو کیا تم آئے تھے؟'' وہ درمیان میں بول اٹھے۔

عمر نے سر اثبات میں خم دیا۔

''میں شام کو ہی پیسے دینے آیا تھا۔ مجھے ادھار دینا تو یاد رہا تھا حالانکہ میں یہ بھول گیا کہ اسکول بند ہو جانے کے بعد کینٹین بھی بند ہو جاتی ہے۔۔ وہ بیس روپے کی ادھار پوری رات میرے ساتھ رہی تھی۔ اگلے دن ٹفن سے پہلے میں نے پیسہ جیب میں سنبھالا تھا۔ لیکن ادھار ادھار ہی رہا۔ کینٹین ہفتے کے لئے بند ہو گیا۔ بابا کی نصیحت مجھے جی بھر کے یاد آئی۔ ادھار ایک بار چڑھ جائے تو وہ کبھی نہیں اترتا۔ اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ کبھی میں تو کبھی آپ دکھائی نہیں دیے۔ پھر پرچے کے دنوں میں ذہن سے بات نکل گئی۔ چھٹی ہو گئی۔ اسکول خالی ہو گیا۔'' وہ سوچ کے بول رہا تھا۔

رامو بغور اسے سن رہا تھا۔ اس کے پاس اس کا پیسہ تھا یہ بات تو وہ اسی وقت بھول گیا تھا۔

''شہر چھوٹ گیا۔ مصروف ہو گیا۔ وہ بات بھول گیا۔ جس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔'' عمر نے خجل سے سر جھکا لیا۔ اور پھر ہولے سے ان کا ہاتھ تھام کے اپنا ادھار والا پیسہ ان کے ہاتھ میں رکھا۔ ''ہفتہ پہلے ہی مجھے میرا پہلا اور آخری ادھار یاد پڑا تو میں وہ ادا کرنے یہاں چلا آیا۔'' اس کے دل سے بوجھ ایک دم سے سرک گیا۔ ''تم محض اس کے لئے آئے تھے؟'' رامو کو سخت تعجب ہوا۔ بھلا کوئی بیس روپے کی ادھاری کون یاد رکھتا ہے۔ لیکن اس نوجوان نے یاد رکھا۔

''جی۔'' وہ مسکرا دیا۔ ''ادھار کا بوجھ تو اتارنا ہی تھا ناں۔'' عمر اکمل جاتے جاتے رامو کے بیٹے کو علاج کے لئے مزید پیسے دے گیا تھا اور تاکید کی تھی کہ یہ بات اپنے باپو کو مت بتانا۔ اس نے مستحسن نگاہ سے اس مددگار کو دیکھا تھا۔

''کبھی وہ سب کی مدد کرتے تھے۔ آج میں نے کر دی۔'' جب وہ واپسی کو ٹرین میں بیٹھ رہا تھا۔ تو وہ مسکرا رہا تھا۔

❑❑❑

شاذیہ خان

لکشمن داس بلڈنگ، نشاط گنج لکھنؤ

8887984564

عہد

آج وہ بہت خوش ہے اس نے خوشی خوشی گھر کا سارا کام کیا کیونکہ آج اُسے اپنی ماں کی صحت ٹھیک دکھائی دے رہی تھی، آج ماں کی کھانسی میں بھی آرام تھا، اور اُن کے منہ پر آج رونق دکھائی دی یہ اس بات کی علامت تھی کہ ماں کی طبیعت میں کافی سدھار ہوا ہے۔ اپنے ماں کی اکلوتی بیٹی تھی وہ یعنی کہ نیلوفر، والد اُس کے ایک چھوٹی سی کمپنی میں سیکیورٹی گارڈ کی پوسٹ پر ملازم تھے، ایک چھوٹا بھائی تھا جو آٹھویں جماعت میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ نیلوفر ہی کے سر پر ساری ذمہ داریاں تھیں، والد کو وقت سے ناشتہ اور کھانا بنا کر دینا ساتھ ہی ماں کی دوائیوں کو بھی وقت سے دینا اور چھوٹے بھائی کو اسکول کے لیے ٹفن دینا۔ یہ ساری ذمہ داریاں وہ بڑی خوشی خوشی ادا کر رہی تھی، ساتھ ہی اُس کو بھی اسکول جانا ہوتا تھا کیونکہ وہ ایک جونیر ہائی اسکول میں انگلش کی ٹیچر تھی۔ نیلوفر نے انگلش سے گریجویشن کیا تھا اور اس کی انگلش اچھی ہونے کی وجہ سے اُسے لکھنؤ کے ایک کانونٹ اسکول میں ٹیچر کی جاب آسانی سے مل گئی تھی، والد کی تنخواہ اور اس کی تنخواہ ملا کر گھر آسانی سے چل جاتا تھا لیکن ایک دن جس کمپنی میں اُس کے والد کام کر رہے تھے وہ بند ہوگئی اور نیلوفر کے والد گھر پر بیٹھ گئے۔ اب ساری ذمہ داری نیلوفر پر ہی آگئی۔

نیلوفر کے والد دن بھر ادھر ادھر بھٹکتے رہتے لیکن اُن کو کوئی سیکورٹی گارڈ کی جاب نہ ملتی، تھک ہار کر وہ گھر پر بیٹھ گئے اور کچھ عرصہ بعد فکر سے ان کی بھی طبیعت خراب ہوگئی۔ آئے دن والدین میں جھگڑا ہوتا، نیلوفر کی والدہ کہتیں کہ جاؤ کہیں کچھ کام وغیرہ کرو، لڑکی جوان ہوگئی ہے اس کی شادی کا انتظام کرنا ہے، لڑکے کی تعلیم پر پیسہ خرچ ہوگا کچھ تو کہیں جا کر کام کرو۔ لیکن کام نہ ملنا تھا نہ ملا، اور گھر کے حالات بد سے بدتر ہوتے گئے، لے دے کر جو کچھ نیلوفر کو ملتا اُسی سے گھر کا خرچ چلتا۔

نیلوفر کے والد سیتا پور کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، لکھنؤ میں اُن کے ایک ماموں زاد بھائی شہزاد نے اُن کو سیکورٹی گارڈ میں رکھوا دیا تھا اور تب سے وہ یہ جاب کر رہے تھے، کچھ دنوں بعد شہزاد کا ایک ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا تھا، تب سے مانو نیلوفر کے والد کے سر سے سایہ اٹھ گیا ہو، کیونکہ لکھنؤ جیسے شہر میں اُن کا کوئی دوسرا ہمدرد نہ تھا، شہزاد ہی نے پرانے لکھنؤ میں ایک کرایہ کا مکان دلا دیا تھا، اپنے گھر کے پاس، لیکن شہزاد کے انتقال کے بعد شہزاد کے گھر والوں نے نیلوفر کے گھر والوں سے نظریں پھیر لی تھی، اور کسی بھی قسم کی کوئی مدد تو کرنا دور وہ لوگ ان لوگوں سے ملنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے، کیونکہ وہ لوگ نیلوفر کے گھر والوں کو ہی اس ایکسیڈنٹ کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ ادھر نیلوفر کے رشتے آنا شروع ہو گئے تھے، لیکن جتنے بھی رشتے آتے وہ یا تو ڈرائیور ہوتے یا کوئی نل والا ہوتا، ایک دن پڑوس کی ایک محترمہ آئیں، اور نیلوفر کی والدہ سے کہا کہ آپ کی بیٹی بڑی پیاری ہے کہیے تو میں ایک رشتہ بتاؤں، لڑکے کی آمدنی بہت اچھی ہے۔ نیلوفر کی والدہ نے پوچھا کہ لڑکا کیا کرتا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ لڑکا کسی کمپنی میں ملازم ہے اور یہ کہہ کر لڑکے کا بایوڈاٹا دیتی ہوئی چلی گئیں۔ پڑوسن کے جانے کے بعد انہوں نے لڑکے کا بایوڈاٹا دیکھا تو دنگ رہ گئیں کیونکہ جس لڑکے کی فوٹو اُس میں تھی اس کو تو اس نے ایک دن پولیس کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تھا، یعنی کہ پولیس اس کو کسی کیس میں اپنے ساتھ لیے جا رہی تھی۔ بایوڈاٹا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، اور دل ہی دل میں پڑوسن کو برا بھلا کہنے لگی، کہ اس طرح کے رشتہ جھوٹ اور فریب سے دینے کی کیا ضرورت آن پڑی، ضرور اُسی لڑکے نے یہ رشتہ بھیجا ہوگا۔ نہ جانے کیا کیا خیالات دل میں آ رہے تھے، تبھی نیلوفر نے آ کر اپنی ماں سے پوچھا کہ ممی کیا سوچ رہی ہیں؟ زیادہ فکر مت کیجئے اپنی صحت کا خیال رکھیے، کیونکہ جو اللہ کی مرضی ہوگی وہی ہوگا۔ سب کچھ اُسی پر چھوڑ دیجئے۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنی والدہ کو دوا پلائی اور کہا کہ میں اسکول جا رہی ہوں۔ اپنا خیال رکھیے گا۔ کھانا بنا دیا ہے جب بھوک لگے تو کھا لیجئے گا۔

> ”جب پروگرام ختم ہوگیا ساری ذمہ داری نیلوفر کی تھی، بچوں کو اسکول تک پہنچانے کی، سبھی بچوں کے والدین کو اپنے بچوں کو لینے کے لیے آنا تھا لیکن کچھ والدین نہیں آئے، جن کی ذمہ داری نیلوفر پر تھی، نیلوفر نے کہا کوئی بات نہیں میں اسکول تو جا رہی ہوں ان بچوں کو بھی اپنے ساتھ لیتی جاؤں گی، چونکہ نیلوفر ان بچوں کا بیحد خیال رکھتی تھی، اس لیے بچوں کو ایک دوکان سے چیزیں دلوانے لگی، بچوں نے خوب مزے لے لے کر چیزیں کھائیں، ان بچوں میں ایک بچہ نظر بچا کر وہاں سے نکل گیا، وہ گھبرا گئی، ادھر ادھر دیکھا اور کافی ڈھونڈھا، مگر وہ بچہ یعنی کہ ٹنکو کہیں بھی نہ ملا، تھک ہار کر وہ پتہ لگانے ٹنکو کے گھر پہنچ گئی لیکن وہاں بھی وہ نہ پہنچا تھا، ٹنکو کی ماں نے پوچھا کہ اگر وہ تمہارے ساتھ نہیں ہے اور یہاں بھی نہیں آیا تو ٹنکو گیا کہاں؟ کافی باتیں ٹنکو کی والدہ نے نیلوفر کو سنائی، نیلوفر کو کافی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا“۔

ماں نے کہا آج میری بات سن لو تب اسکول جاؤ دو منٹ دیری سے بھی پہنچے گی تو کوئی بات نہیں کون سا آسمان گر جائے گا۔نیلوفر نے کہا کہ آپ وہی شادی کی بات کریں گی اُس میں مجھے کیا کہنا ہے میں تو بس اتنا چاہتی ہوں کہ میرا چھوٹا بھائی کسی طرح پڑھ لکھ کر قابل ہو جائے اور اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے تب میں شادی کے بارے میں سوچوں گی کیونکہ یہ گھر کیسے چلے گا بھائی ابھی تعلیم حاصل کر رہا ہے، والد کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اور وہ بھی بستر پر لگ گئے ہیں، گھر کا کرایہ کہاں سے دیا جائے گا وغیرہ وغیرہ ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں شادی کے بارے میں ابھی سوچ نہیں سکتی۔

نیلوفر کی والدہ نے کہا کہ دنیا کا دستور ہے وقت سے اگر شادی نہیں ہوتی تو پھر اچھے رشتے آنا بند ہو جاتے ہیں، اور میں تو تیری ماں ہوں، ماں ایک سہیلی جیسی ہوتی ہے اس لیے جو کچھ تمہیں کہنا ہو وہ سب کچھ مجھ سے بلا تکلف بیان کیا کرو، اور اُسی حساب سے آگے تدبیر کی جائے۔نیلوفر نے کہا کہ جو آپ کے سمجھ میں آئے ممی کیجئے میں تو اسکول چلی کیونکہ اسکول جانے میں تاخیر ہو رہی ہے اور یہ کہتے ہوئے وہ اسکول روانہ ہوگئی۔

جس کانونٹ اسکول میں نیلوفر پڑھاتی تھی وہاں کے چھوٹے بچوں کا وہ بڑا خیال رکھتی تھی، بڑے سلیقہ سے اُن کو پڑھاتی تھی، رویندرالیہ میں اسکول کا ایک پروگرام ہونے والا تھا اس کی ساری ذمہ داری نیلوفر ہی کو ملی ہوئی تھی لہٰذا وہ بڑی محنت اور لگن سے بچوں کے پروگرام کی تیاری میں جٹی ہوئی تھی۔ایک دن آہی گیا کہ اس پروگرام کا انعقاد بڑی شان سے ہوا اور نیلوفر نے اپنا اسکول میں نام روشن کر دیا، جتنے بھی اُس کے کلاس کے بچے تھے سب لوگوں نے اپنا کردار اس پروگرام میں بخوبی انجام دیا۔بچوں کے والدین آئے تھے سبھی لوگوں نے اسکول کی بڑی تعریف کی کہ بہت ہی اچھا پروگرام ہوا۔سبھی بچوں کو انعامات سے نوازا گیا، اور آخر میں نیلوفر کو بھی اسکول کے پرنسپل نے انعام سے نوازا اور سب کے سامنے بڑی تعریف کی اور انہوں نے کہا کہ واقعی نیلوفر میم کی وجہ سے آج اس پروگرام کو لوگوں نے بہت پسند کیا، نیلوفر بیحد خوش تھی کہ اُس کی محنت رائیگاں نہیں گئی اور سب کچھ اچھے سے انجام تک پہنچ گیا، جتنی بھی اس نے محنت کی تھی سب کچھ اچھی طرح سے ہو گیا، واقعی محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی، اس نے سوچا کہ جب وہ گریجویشن کر رہی تھی تو اس نے بھی ولیم شیکسپیئر کو پڑھا تھا اور اس کے ڈرامے اُرے مرچنٹ آف وینس، اتھیلو، لیڈی میک بیتھ، اے مڈسمر نائٹ ڈریم وغیرہ کے ذریعہ یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی تھی محنت کا کوئی بھی آپشن نہیں ہے، اگر محنت کروگے تو کامیابی قدم چومے گی اور آج اس کے اچھے پروگرام ہو جانے کی وجہ سے وہ خوشی سے جھوم رہی تھی، اور خود پر فخر کر رہی تھی۔

جب پروگرام ختم ہو گیا ساری ذمہ داری نیلوفر کی تھی، بچوں کو اسکول تک پہنچانے کی، سبھی بچوں کے والدین کو اپنے بچوں کو لینے کے لیے آنا تھا لیکن کچھ والدین نہیں آئے ، جن کی ذمہ داری نیلوفر پر تھی، نیلوفر نے کہا کوئی بات نہیں میں اسکول تو جا رہی ہوں ان بچوں کو بھی اپنے ساتھ لیتی جاؤں گی، چونکہ نیلوفر ان بچوں کا بیحد خیال رکھتی تھی، اس لیے بچوں کو ایک دوکان سے چیزیں دلوانے لگی، بچوں نے خوب مزے لے لے کر چیزیں کھائیں، ان بچوں میں ایک بچہ نظر بچا کر وہاں سے نکل گیا، وہ گھبرا گئی، ادھر ادھر دیکھا اور کافی ڈھونڈھا، مگر وہ بچہ یعنی کہ ٹنکو کہیں بھی نہ ملا، تھک ہار کر وہ پتہ لگانے ٹنکو کے گھر پہنچ گئی لیکن وہاں بھی وہ نہ پہنچا تھا، ٹنکو کی ماں نے پوچھا کہ اگر وہ تمہارے ساتھ نہیں ہے اور یہاں بھی نہیں آیا تو ٹنکو گیا کہاں؟ کافی باتیں ٹنکو کی والدہ نے نیلوفر کو سنائی، نیلوفر کو کافی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا اور پریشانی کے عالم میں وہ پھر اسکول گئی لیکن وہاں بھی وہ نہ ملا، تھک ہار کر وہ گھر پہنچی اور اپنی والدہ کو سب کچھ بیان کیا۔والدہ نے نیلوفر سے کہا کہ پریشان مت ہو ٹنکو گھر پہنچ جائے گا، لیکن تم بھی تو میرا کہنا نہیں سنتی ہو۔ہمیشہ دوسروں کی فکر میں مبتلا رہتی ہو، چلو اللہ سے دعا کرو، دعا میں بڑی طاقت ہوتی ہے، ٹنکو صحیح سلامت اپنے گھر پہنچ جائے گا، ابھی یہ لوگ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اسکول سے فون آیا کہ ٹنکو مل گیا ہے وہ اپنی نانی کے گھر چلا گیا تھا، اور نانی کو وہ بہت چاہتا ہے چونکہ نانی کے پاس فون بھی نہیں تھا اس لیے وہ اطلاع نہیں دے پایا، نانی ضعیف ہے اس لیے وہ ٹنکو کو اس کی ماں کے پاس نہیں پہنچا پائی۔ٹنکو مل گیا یہ سن کر یہ بہت خوشی کی بات ہے۔نیلوفر کی جان میں جان آئی۔

نیلوفر نے فون کر کے ٹنکو کی والدہ سے پوچھا تو ٹنکو کی والدہ نے نیلوفر سے معافی مانگی اور کہا کہ میں نے تمہیں بہت برا بھلا کہا اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں تھی، میں اپنی بات پر بیحد شرمندہ ہوں، نیلوفر نے کہا کوئی بات نہیں ہر والدہ کا فرض ہے اپنے بچے کے تئیں الرٹ رہنے کا، آپ نے بھی وہی کیا جو اس وقت کوئی بھی ہوتا یہی کہتا۔کوئی بات نہیں۔آپ کو معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

نیلوفر کا چھوٹا بھائی اب ہائی اسکول کر چکا تھا، اور نیلوفر بھی ہیڈ ٹیچر ہوگئی تھی، اور تنخواہ میں کافی اضافہ ہو گیا تھا، گھر کا ماحول سازگار ہونے لگا تھا، لیکن آج اس نے ماں کی گود میں اپنا سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ روتے ہوئے کہا کہ ممی آپ صحیح کہتی تھیں کہ ضرورت سے زیادہ کسی کی فکر نہیں کرنا چاہیے اور میں آج سے یہ عہد کرتی ہوں کہ میں اپنے کام سے کام رکھوں گی، اور اتنی ہی فکر کروں گی جتنا وہ اس کا مستحق ہوگا۔کیونکہ اللہ تعالیٰ بھی انہیں کی مدد کرتا ہے جو اپنی فکر اور مدد خود کرتا ہے۔یہ سن کر نیلوفر کی ماں بہت خوش ہوئی اور اس کو بڑے پیار سے اپنے گلے لگا لیا۔

❑❑❑

لکھنؤ ایجنسی

ماہ نامہ نیا دور کے وہ قارئین جو اس کے مستقل ممبر نہیں ہیں اگر وہ نیا دور کی خریداری کے خواستگار ہیں تو لکھنؤ میں ان مندرجہ ذیل ایجنسیوں سے رابطہ کریں۔

دانش محل:

امین آباد لکھنؤ۔ 9792361533

عرش پبلیکیشنز:

خواجہ ٹاور، وکٹوریہ اسٹریٹ، چوک لکھنؤ۔ 9935915110

شاہد عباس

مفتی گنج، چوک، لکھنؤ

9839346181

ترقیات

بہتر تعلیم سے یوپی کی بدلتی تصویر

سب کو تعلیم بہتر تعلیم سے بدلتی تصویر سال 2024 کی سالانہ تعلیمی صورتحال کی رپورٹ (اے ایس ای آر) کے مطابق* سال 2022-23 سے 2024-25 کے درمیان سیکنڈری اسکولوں میں سیکھنے کی سطح میں 23 فیصد کا اضافہ* پرائمری سطح (کلاس 1-5) پر 5.11 فیصد کا اضافہ* ہائر سکینڈری سطح (کلاس 6-8) پر سیکھنے میں 6.9 فیصد کا اضافہ* لائبریری کے استعمال میں 2.55 فیصد کا اضافہ لڑکیوں کے لیے بیت الخلا کی دستیابی میں 4.54 فیصد کا اضافہ پروجیکٹ النکار پروجیکٹ النکار پروجیکٹ کا آغاز 1 اکتوبر 2021 کو ہوا تھا۔ اس کا مقصد ریاست کے 2,441 سرکاری اور 4,512 امداد یافتہ اسکولوں میں 35 معیاروں (اسمارٹ کلاس، ڈیجیٹل بورڈ پروجیکٹر، لیبارٹریز، کھیل کا میدان، انٹرنیٹ وغیرہ) کی صد فیصد تکمیل کو یقینی بنانا ہے۔ 1,357 کروڑ (1028 کروڑ اتر پردیش حکومت، 124 کروڑ سمگر شکشا فنڈ، 89 کروڑ سی ایس آر، 68 کروڑ مقامی بلدیاتی ادارے اور 48 کروڑ عوامی شراکت کے ذریعے) کا عوامی شراکت ماڈل۔ پہلے مرحلے میں 439 امداد یافتہ اسکولوں کے لیے 3.204 کروڑ منظور کیے گئے۔ 3.4 لاکھ سے زیادہ طلباء مستفید ہوئے۔ 567 امداد یافتہ سنسکرت اسکولوں میں بنیادی ڈھانچے میں بہتری کا عمل جاری ہے۔ 1150 کثیر المقاصد ہال، 778 مواصلاتی لیبارٹریز، 599 نئے بیت الخلا، 116 کھیل کے میدان، 755 باؤنڈری وال، 482 اضافی کمرے، 1050 اسکولوں میں مربوط خدمات اور 101 خودکار ٹیسٹنگ لیبز کا قیام۔ 15 اسکول گروپوں کو مثالی کلسٹر اسکولوں میں مکمل طور پر تبدیل کیا گیا۔ 139 اپ گریڈ شدہ کستوربا گاندھی بالیکا ودیالیہ کی نئی تعمیر شدہ عمارتوں اور اضافی ہاسٹل کا افتتاح۔ 7,409 اسکولوں میں اسمارٹ کلاس، 5,258 اسکولوں میں آئی سی ٹی لیب کی سہولت۔ ریاستی تعلیمی تکنیکی ادارے میں قائم ایجوکیشنل براڈ کاسٹنگ اسٹوڈیو کا افتتاح۔ تمام ہائر سکینڈری بورڈ اور کمپوزٹ اسکولوں میں سمر کیمپ انوویشن کا آغاز۔ 43 وزیر اعلیٰ ماڈل کمپوزٹ

اسکولوں اور 66 وزیر اعلیٰ ابھیودیہ کمپوزٹ اسکولوں کا سنگ بنیاد۔ 503 پی ایم شری اسکولوں میں ڈیجیٹل لائبریری کا آغاز۔ کلاس 3 سے 12 کے طلباء کے اسپاٹ اسمنٹ کے لیے نِپُن پلس ایپ کا آغاز۔ ہر اسمبلی حلقہ میں ایک وزیر اعلیٰ کمپوزٹ اسکول کے قیام کا فیصلہ۔ 1.93 کروڑ بچوں کو پریشد اسکولوں میں معیاری تعلیم۔ طلباء کو مفت یونیفارم، سویٹر، اسکول بیگ، جوتے، موزے فراہم کرنے کے لیے ان کے والدین کے اکاؤنٹ میں ڈی بی ٹی کے ذریعے ہر سال ہر طالب علم کے لیے 1200 روپئے منتقل کیے جاتے ہیں۔

18 ڈویژنوں میں اٹل آواسیہ ودیالیہ کا آپریشن۔ اسکول چلو ابھیان اور شاردا پروگرام (ہر روز اسکول آئیں) کے تحت 40 لاکھ اضافی بچوں کا داخلہ۔ 120 جے پرکاش نارائن سروودیا ودیالیہ کا آپریشن۔ 60 فیصد شیڈولڈ کاسٹ/ٹرائب، 25 فیصد دیگر پسماندہ طبقات اور 15 فیصد جنرل کیٹیگری کے طلباء کے داخلے کا انتظام۔ بیسک ایجوکیشن کے پرائمری بورڈ اور ہائر سکینڈری بورڈ اسکولوں کے 2.10 لاکھ اساتذہ کو ٹیبلٹ کی تقسیم۔ آپریشن کایا کلپ کے تحت پرائمری اور ہائر سکینڈری اسکولوں میں 19 بنیادی انفراسٹرکچر سہولیات کی تکمیل۔ شاردا پروگرام کے تحت سال 2024-25 میں 7.77 لاکھ بچوں کا بورڈ اسکولوں میں داخلہ۔ ہائر سکینڈری اور کلاس 01 سے کلاس 08 تک کے 377 پریشد اسکولوں کو وزیر اعلیٰ ابھیودیہ کمپوزٹ اسکول کے طور پر اپ گریڈ کیا گیا۔ کمزور طبقے کی لڑکیوں کو کلاس 12 تک مفت رہائشی تعلیم، 680 کستوربا گاندھی بالیکا ودیالیہ کو اپ گریڈ کیا گیا۔ غیر سہولت یافتہ علاقوں میں 39 نئے ہائی اسکول اور 14 نئے انٹر کالجوں کی تعمیر۔ 25.6 فیصد کا گراس انرولمنٹ ریٹ (جی ای آر)، 2035 تک 50 فیصد تک بڑھانے کا ہدف۔ سب کو شکشا کا ادھیکار ڈبل انجن کی سرکار۔

❑❑❑

وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ کی رہائش گاہ پر صوبائی پولیس سروس کے 91ویں بیچ کے زیرِ تربیت افسران نے ملاقات کی۔

وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ ’’کسان کا سمّان اتر پردیش کی پہچان‘‘ اسکیم کے تحت خاتون کو چیک دیتے ہوئے۔

वर्ष : 79 अंक 1
मई, 2024
मूल्य : 15 रु./—
वार्षिक मूल्य : 180 रु./—

उर्दू मासिक, **नया दौर**
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ — 226 001

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006—08
ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. स्वत्वाधिकारी के लिए **विशाल सिंह**, निदेशक, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. लखनऊ द्वारा प्रकाशित तथा प्रकाश एन. भार्गव, प्रकाश पैकेजर्स, प्रथम तल, शगुन पैलेस, 3—सप्रू मार्ग, लखनऊ द्वारा मुद्रित, सम्पादक— **रेहान अब्बास**